# مطالعاتی رہنما

ایم۔فل اردو

## ادبی تحریکات اور تنقیدی نظریات
## کوڈ نمبر 722

شعبہ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

''جملہ حقوق محفوظ ہیں''

ایڈیشن _____ اول

اشاعت _____ 2003ء

تعداد اشاعت _____ 500

قیمت _____ -/60 روپے

نگران طباعت _____ محمد ریاض خان

طابع _____ ٹی ایس پرنٹرز، گوالمنڈی راولپنڈی

فون نمبر 5771659, 5555651

ناشر _____ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

# کورس ٹیم

| | | |
|---|---|---|
| چیئرمین | : | پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی |
| رابطہ کار | : | ڈاکٹر میاں مشتاق احمد |
| تحریر | : | پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق شبلی |
| | | ڈاکٹر محمود الرحمان |
| | | پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی |
| | | پروفیسر نظیر صدیقی |
| نظر ثانی | : | پروفیسر آفتاب اقبال شمیم |
| تدوین | : | بشیر محمود اختر |

# ترتیب


| نمبر شمار | یونٹ | | صفحات |
|---|---|---|---|
| | سرآغاز | | |
| | کورس کا تعارف | | 5 |
| | کورس کا خاکہ | | 7 |
| یونٹ | ۱۔۲ | علی گڑھ تحریک | 9 |
| یونٹ | ۳۔۴ | اردو ادب کی رومانوی تحریک | 21 |
| یونٹ | ۵۔۶ | ترقی پسند تحریک | 35 |
| یونٹ | ۷۔۸ | حلقہ ارباب ذوق کی تحریک | 53 |
| یونٹ | ۹۔۱۰ | پاکستانی ادب / اسلامی ادب کی تحریک | 69 |
| یونٹ | ۱۱۔۱۲ | انیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر | 85 |
| یونٹ | ۱۳۔۱۴ | بیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر | 107 |
| یونٹ | ۱۵۔۱۶ | حقیقت نگاری، فطرت نگاری اور شعور کی رو | 121 |
| یونٹ | ۱۷۔۱۸ | وجودیت، فلسفے اور ادب میں | 139 |

# کورس کا تعارف

اردو ایم فل کے دوسرے کورس کا عنوان ''ادبی تحریکات اور تنقیدی نظریات'' ہے۔اس کورس میں انہی تحریکات اور نظریات کو شامل کیا گیا ہے جو یا تو اردو ادب کے تاریخی ارتقا کے دوران خود اردو ادب میں پیدا ہوئے یا جو دوسرے ادب میں پیدا ہونے کے باوجود اردو ادب پر اثر انداز ہوئے ۔اردو ادب سے متعلق ادبی تحریکات اور تنقیدی نظریات اتنے ہی نہیں ہیں جتنے اس کورس میں شامل کیے گئے ہیں ۔دراصل اس کورس میں اہم ترین تحریکات اور نظریات کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔اردو ادب میں ان تحریکات کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اردو ادب میں ان تحریکات اور نظریات پر بہت کم لکھا گیا ہے،خصوصاً ان تنقیدی نظریات پر جو مغربی ادب سے اردو ادب میں آئے ہیں، کتابیں تو ایک طرف مضامین تک نہیں ملتے ۔ان نظریات کے بارے میں انگریزی اور امریکی ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اول تو انگریزی اور امریکی ادب کی وہ کتابیں اور مضامین سہل الحصول نہیں اور جس حد تک وہ پاکستان کی بعض بیرونی لائبریریوں میں دستیاب ہیں اُس حد تک بھی ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے۔

اسی لیے اس کورس میں تنقیدی نظریات سے متعلق یونٹوں میں بنیادی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں اور متعلقہ انگریزی کتابوں کے حوالے دے دیئے گئے ہیں کہ اگر وہ دستیاب ہو سکیں تو تفصیلی استفادے کے لیے ان سے رجوع کیا جائے۔وہ تنقیدی نظریات اردو ادب میں اب تک صرف اصطلاحات کی حیثیت رکھتے آئے ہیں۔ان کی تھوڑی سی وضاحت ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں ملتی ہے اور بس۔

اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اردو ادب کی اہم ادبی تحریکات اور تنقیدی نظریات سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔یہ کورس اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی

صدر شعبہ اردو

# کورس کا خاکہ

یونٹ ۱۔۲ علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک کا تعارف ۔کتابیات ۔علی گڑھ تحریک کا تفصیلی مطالعہ۔

خودآ زمائی

یونٹ ۳۔۴ اردو ادب کی رومانوی تحریک

موضوع کا تعارف ۔کتابیات ۔تفصیلی مطالعہ۔خودآ زمائی

یونٹ ۵۔۶ ترقی پسند تحریک

تعارف ۔ترقی پسند تحریک کا پس منظر۔کتابیات ۔خودآ زمائی ۔ترقی پسند تحریک کا قیام' منشور اور مقاصد۔کتابیات ۔خود آ زمائی ۔ترقی پسند تحریک کا فروغ اور مشہور (مصنفین )۔کتابیات ۔خودآ زمائی ۔اردو ادب پر تحریک کے اثرات (شاعری' افسانہ' تنقید )کتابیات ۔خودآ زمائی ۔ترقی پسند تحریک کے خلاف ردعمل ۔کتابیات ۔خودآ زمائی ۔مزید مطالعے کے لیے مضامین و کتب کی فہرست

یونٹ ۷۔۸ حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک

موضوع کا تعارف ۔کتابیات ۔تفصیلی مطالعہ۔خودآ زمائی

یونٹ ۹۔۱۰

پاکستانی ادب / اسلامی ادب کی تحریک ۔موضوع کا تعارف ۔کتابیات ۔

تفصیلی مطالعہ۔خودآ زمائی

یونٹ ۱۱۔۱۲

انیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعرا انیسویں صدی کے مغرب میں شاعری سے متعلق بحثوں کا تاریخی پس منظر۔رومانوی شاعری اور اس کے دو ممتاز نمائندوں کے نظریات شعر۔وکٹورین عہد کے عظیم نقاد میتھو آرنلڈ کا نظریہ شعر۔اردو شعر و ادب پر رومانوی شاعری اور علامتی شاعری کے اثرات۔مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست۔امدادی کتابوں کی فہرست۔خود آزمائی۔

یونٹ ۱۳۔۱۴

بیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر۔بیسویں صدی میں مغربی شاعری کی تحریکات بیسویں صدی میں شاعری کے مسائل۔خالص شاعری۔پورا آدمی۔سائنس اور شاعری۔روایت اور جدیدیت۔مجوزہ کتابوں کی فہرست۔خود آزمائی۔

یونٹ ۱۵۔۱۶

حقیقت نگاری۔فطرت نگاری اور شعور کی رو۔ امدادی کتابوں کی فہرست۔خود آزمائی

یونٹ ۱۷۔۱۸

وجودیت۔فلسفے اور ادب میں وجودیت۔فلسفے میں وجودیت۔ادب میں وجودیت۔مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست۔

خود آزمائی

یونٹ ۱۔۲

# علی گڑھ تحریک

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق شبلی

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کا تعارف و مقاصد | 11 |
| ۱۔ | علی گڑھ تحریک (تعارف) | 12 |
| ۲۔ | کتابیات | 14 |
| ۳۔ | علی گڑھ تحریک کا تفصیلی مطالعہ | 15 |
| ۴۔ | خود آزمائی | 18 |

# یونٹ کا تعارف ومقاصد

عزیز طلباء وطالبات:

آپ نے کورس نمبر ا میں علی گڑھ تحریک کے بارے میں پڑھا ہے۔اس یونٹ کے ذریعے آپ اس تحریک سے تفصیلی طور پر متعارف ہوں گے۔علی گڑھ تحریک کا مطالعہ کرتے وقت آپ یونٹ کے مقاصد کو ضرور پیش نظر رکھیں۔اس یونٹ میں دیئے گئے اشارات کے مطابق مطالعہ کر کے آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ علی گڑھ تحریک کے تاریخی وسیاسی پس منظر کو سمجھ کر اس کے محرکات ومقاصد کا تجزیہ کر سکیں۔

۲۔ اس تحریک کی بدولت جو افکار عام ہوئے ان کا جائزہ لے سکیں۔

۳۔ سرسید، ان کے رفقاء اور پیروکاروں کی تصانیف میں ان افکار کی نشاندھی کر سکیں۔

۴۔ اردو ادب پر اس تحریک کے اثرات کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

۵۔ اس تحریک کے خلاف ردعمل کی جو صورتیں سامنے آئیں۔ان پر تنقیدی نظر ڈال سکیں۔

## ۱۔ علی گڑھ تحریک (تعارف)

تفصیلی مطالعے سے پہلے تحریک کا مختصر تعارف غور سے پڑھیئے۔

۱۸۵۷ء میں برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ان کا زوال بھی ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا لیکن ان کے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لیے فوری اور طویل المیعاد اقدامات کی منصوبہ بندی کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔یہ منصوبہ بندی علی گڑھ تحریک کے قافلہ سالار سرسید احمد خان کے تدبر کا نتیجہ تھی۔اس تحریک کو عام طور پر ایک سیاسی اور تعلیمی تحریک خیال کیا جاتا ہے لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ ایک بڑی ہمہ گیر تحریک تھی جس نے برصغیر کے مسلم معاشرے کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ان شعبوں میں معاشرت وسیاست اور مذہب وادب خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس تحریک کے ذریعے برصغیر کے مسلمان ترقی یافتہ مغرب کے

جدید افکار سے روشناس ہوئے اور اس طرح وہ قرون وسطیٰ کی فکری فضا سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوئے جس سے ان کی سوچ میں تبدیلی آئی اور وہ جدید انداز اپنا کر ترقی کی جدوجہد میں شریک ہوئے۔

اس تحریک نے برصغیر کے شکست خوردہ مسلمانوں کے دل میں زندگی کے برحق ہونے کا یقین پیدا کیا۔ انھیں عقل و دانش کی برتری اور ہمہ گیر نوعیت کا احساس دلایا ''اس جہاں'' کے ساتھ ''اس جہان'' کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ اس عہد کے ادب نے مادی دنیا کو ایک زندہ اور ٹھوس نظام کی حیثیت سے دیکھا اور پیش کیا۔ اس کائنات کو کارخانہ قدرت میں سمجھا اور اسے انسان کی جدوجہد کا میدان بھی قرار دیا۔ انسان اور کائنات کے تعلق کی عقلی تفسیر اس عہد میں عام ہوئی۔ اردو ادب میں انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعی شعور کا اظہار بھی اسی عہد سے شروع ہوا اور ادب میں مقصدیت پر زور بھی اسی تحریک کی دین ہے۔ اس طرح علمی و ادبی تحریک کے زیرِ اثر فکر و نظر میں ایک اہم انقلاب آیا اور ادب کے اسالیب اور موضوعات میں بھی تبدیلی آئی۔

اسی تحریک سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا۔ مغرب کے زیر اثر بعض نئی اصناف ادب اردو میں رائج ہوئیں' ان میں ناول' سوانح نگاری' مضمون نگاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اردو میں تنقید نگاری کی اصل بنیاد بھی اسی زمانے میں رکھی گئی۔ تاریخ نگاری کا علمی انداز بھی اسی دور میں پیدا ہوا۔ نیچرل شاعری اسی تحریک کا ثمر ہے۔ ان سب کاوشوں کے ساتھ ساتھ مذہب پر عالمانہ تصانیف کا ایک گراں قدر سرمایہ اس دور میں فراہم ہوا جس میں مذہب کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسلامی تاریخ کے بعض اہم پہلوؤں کو بھی موضوع تحقیق بنایا گیا۔ سرسید کے جاری کردہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مقالہ نگاروں نے اس فکری تحریک کو آگے بڑھایا۔

اس تحریک کے زیر اثر جو ادب پیدا ہوا اس کے مخاطب عوام تھے' اس لیے لکھنے والوں نے ابلاغ پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ سادہ نویسی اور مدعا نگاری پر خاص توجہ دی گئی۔ اس تحریک کا یہ پہلو بھی بے حد اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس کے ذریعے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر کو بھی اعتبار حاصل ہوا۔ اردو نثر کو اس سے پہلے یہ مقام حاصل نہیں ہوا تھا یہ تحریک مقاصد میں کامیاب رہی لیکن جس طرح ہر تحریک کے خلاف ردعمل بھی ہوتا ہے' اس کے خلاف بھی ہوا۔

## ۲۔ کتابیات

آپ اس تحریک کا مطالعہ مندرجہ زیل کتب کی مدد سے فرمائیں گے:۔


۱۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

''برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ'' (مترجم ہلال احمد زبیری)' کراچی'

کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء

۲۔ ڈاکٹر انور سدید

''اردو ادب کی تحریکیں'' کراچی' انجمن ترقی اردو پاکستان' ۱۹۸۵ء

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

''سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری وفنی جائزہ'' لاہور

مکتبہ کارواں' ۱۹۶۰ء

۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

''اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء '' لاہور' مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۷ء

۵۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

''مباحث'' لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۶۵ء

۶۔ سید فیاض محمود ڈاکٹر عبادت بریلوی (مدیران خصوصی)

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند'' لاہور' پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

۷۔ شیخ محمد اکرام

''موج کوثر'' لاہور' ادارہ ثقافت اسلامیہ' ۱۹۷۵ء

## ۳۔ علی گڑھ تحریک کا تفصیلی مطالعہ

۱۔ علی گڑھ تحریک کا تاریخی وسیاسی پس منظر' محرکات ومقاصد

مندرجہ ذیل کتب کے متعلقہ حصے ملاحظہ فرمائیں:

(الف) برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ'

باب۱۲ ''نئی راہیں'' صفحات ۳۰۴ ۔ ۳۳۰

(ب) موج کوثر' علی گڑھ' صفحات ۳۷ ۔ ۷۷

(ج) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند'

دوسرا باب' صفحات ۴۵۔۴۸

(د) اردو ادب کی تحریکیں'

باب پنجم ' صفحات ۲۷۷۔ ۳۱۳

۲۔ افکار ونظریات

(الف) سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقا کی نثر کا فکری وفنی جائزہ

صفحات ۱۶۔۲۵

(ب) اردو ادب ' صفحات ۴۷۔۵۱

(ج) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند' صفحات ۴۹۔۵۲

(د) اردو ادب کی تحریکیں' صفحات ۳۱۶

(آخری پیراگراف) ۰۰۰ ۳۲۶ (مسلمان قوم کا مفسر بھی تھا)

۳۔ سرسید، ان کے رفقاء اور پیروکاروں کی تصانیف

سرسید کے نامور رفقاء

نواب محسن الملک ، نواب وقار الملک ، مولانا حالی ، مولانا شبلی ،

مولانا نذیر احمد ، مولوی چراغ علی ، مولوی ذکاء اللہ

پیروکار:

الف۔ مولانا وحید الدین سلیم، مولانا عبدالحلیم شرر، نواب حیدر یار جنگ،

مولوی عبدالحق، مولانا طفیل احمد منگلوری، مولوی عزیر مرزا،

مولوی عنایت اللہ۔

ب۔ عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی،

قاضی تلمیذ حسین اور رشید احمد صدیقی

(الف) سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء

(الف) صفحات ۶۳۔۸۱

(ب) صفحات ۳۱۱۔۳۲۰

(ب) تاریخ ادبیات مسلمانان

صفحہ ۵۲

صفحات ۱۰۶۔۱۳۷، ۱۷۳۔۲۰۷، ۲۰۸۔۲۲۲، ۳۳۵۔۳۶۶

(ج) اردو ادب

صفحات ۳۷۔۴۳

(د) اردو ادب کی تحریکیں

صفحات ۳۴۲ (پہلا پیراگراف) ۳۵۳

۴۔ اردو ادب اور علی گڑھ تحریک

(الف) مباحث

صفحات ۲۸۲ (آخری پیراگراف) ۲۸۶

(ب) اردو ادب'
صفحات ۴۳ ـ ۴۷
(ج) تاریخ ادبیات مسلمانان
صفحات ۵۳ـ۶۳
(د) سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا
صفحات ۵۹ـ۶۱ ' ۲۴۹ـ۲۷۹
(ر) اردو ادب کی تحریکیں
صفحات ۳۳۱ (آخری پیراگراف) ۳۴۲ (نصف اول تک)

۵ـ علی گڑھ تحریک کے خلاف ردعمل
شبلی ـ اودھ پنچ ـــ اکبر الٰہ آبادی 'ابوالکلام' رومانوی تحریک
(الف) مباحث' صفحات ۲۸۷ ـ ۲۹۰
(ب) اردو ادب' صفحات ۵۱ ـ ۵۸
(ج) تاریخ ادبیات مسلمانان ـــ صفحات ۱۶۷ـ۱۷۲
(د) موج کوثر
ردعمل ' صفحات ۱۸۸ـ۲۹۵
(ر) اردو ادب کی تحریکیں
صفحات ۳۵۴ (متن کی آخری سطر) ۳۶۴

## ۴ـ خود آزمائی

۱ـ علی گڑھ تحریک برصغیر کے مسلمانوں کو قرون وسطیٰ کی فکری فضا سے نکال کر جدید دور میں لے آئی ـ بحث کیجئے ـ
۲ـ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب کو جو نیا شعور ملا' سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریروں میں اس کی نشاندہی کریں ـ

۳۔ سرسید کے دور میں مذہب پر عالمانہ تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔اس کے اسباب ونتائج پر سرسید اوران کے رفقاء کی تصانیف کے حوالے سے بحث کریں۔

۴۔ سرسید تاریخ سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ان کے اس رجحان نے علی گڑھ تحریک کو کس حد تک اور کس طرح متاثر کیا۔

۵۔ سرسید کی ادبی تحریک نے جہاں پرانے ادب کے بہت سے خلاء پر کیے' وہاں خود بھی بہت سے نئے' شگاف ڈال دیئے۔ بحث کیجئے۔

۶۔ علی گڑھ تحریک' شاعری کے بارے میں زیادہ ہمدردانہ نقطہ نظر نہیں رکھتی تھی۔تردید یا تائید فرمائیں۔

۷۔ علی گڑھ تحریک نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی اعتبار بخشا۔۔۔اسباب ونتائج سے بحث کریں۔

۸۔ علی گڑھ تحریک کی بدولت اردو ادب میں اجتماعی زندگی کا ایک عقلی تصور عام ہوا۔بحث کیجئے

۹۔ سرسید ایک نظر مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو دوسری نظر ماضی پر بھی ڈال لیتے ہیں۔انھوں نے جوان مستقبل اور بوڑھے ماضی کو بیک وقت ہم قدم رکھنے کی کوشش کی۔بحث کیجئے۔

۱۰۔ علی گڑھ تحریک کے خلاف ردعمل کے مختلف رجحانات کا جائزہ لیجئے۔

یونٹ ۳۔۴

# اردو ادب کی رومانوی تحریک

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمان

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کے مقاصد | 23 |
| ۱۔ | موضوع کا تعارف | 24 |
| ۲۔ | کتابیات | 28 |
| ۳۔ | تفصیلی مطالعہ | 29 |
| ۴۔ | خود آزمائی | 33 |

# یونٹ کے مقاصد:

اردو ادب میں رومانوی تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے دوران اس یونٹ کے درج ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تا کہ آپ موضوع کو گرفت میں لاسکیں:

۱۔ رومانوی تحریک کا واضح خاکہ قائم کرسکیں۔

۲۔ مغرب کی رومانوی تحریک سے واقف ہوسکیں۔

۳۔ اردو میں رومانوی تحریک کے آغاز کا سبب معلوم کرسکیں۔

۴۔ رومانوی تحریک کے ادیبوں اوران کے کاموں کا جائزہ لے سکیں۔

۵۔ رومانوی تحریک کے شاعروں کا محاکمہ کرسکیں۔

۶۔ اردو تنقید میں رومانوی عنصر کا تجزیہ کرسکیں

۷۔ اردو ادب پر اس تحریک کے اثرات کا تعین کرسکیں۔

۸۔ اس تحریک کے خلاف ردعمل کی جو صورت رونما ہوئی اس پر ناقدانہ نظر ڈال سکیں۔

## ۱۔ موضوع کا تعارف

**نوٹ:** اردو میں رومانوی تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پہلے ذیل میں درج شدہ تعارف غور سے پڑھ لیجئے۔

دنیائے شعر وادب میں رومان بہت ہی عام سا لفظ ہے مگر اس کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں کسی حد تک غلط متعین ہے۔ اکثر

حسن وعشق کے ذکر کو رومان یا پھر جمالیت کو رومانیت کہہ دیا جاتا ہے جو کلیتہً درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رومانیت جسے انگریزی میں Romanticism کہتے ہیں۔ ایک مخصوص طرز فکر اور زاویہ نگاہ کا نام ہے اور یہ اصطلاح لفظ Romana یا Romance سے مشتق ہے۔ Romana جنوبی خطے کی لاطینی زبان کو کہا جاتا ہے اور Romance زبانیں وہ ہیں جو جنوبی یورپ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

Romana زبان نویں صدی عیسوی میں تحریری زبان بنی اور صدیوں تک وہ صرف عشق ومحبت کی قدیم داستانیں بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ چنانچہ عام اصطلاح میں کوئی خیالی قصہ لکھنے کو رومانس لکھنا کہا جانے لگا۔ چونکہ ان خیالی قصوں میں مبالغہ آرائی ہوتی تھی، اس لیے انگریزی میں مبالغہ آرائی کرنے، ہوائی قلعے بنانے اور خلاف عقل باتیں کرنے کو محاورۃً رومانس لکھنا کہا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ سارا ادب جس کی بنیاد خیال آرائیوں پر ہو، رومانیت رومانوی ادب سے موسوم کیا گیا۔ بعد میں جب لفظ رومانیت ایک اصطلاح کے طور پر رائج ہوا تو ماضی کے پرشکوہ واقعات کو بھی رومانوی ادب کہا جانے لگا۔

یورپ میں اس تحریک کے عروج کا زمانہ اٹھارہویں صدی کے وسط تک ہے۔ اس صدی کو سائنس یا عقلیت کے غلبے کی صدی سمجھا جاتا ہے زندگی میں سادگی، خلوص اور دیانت کی جگہ تصنع، بددیانتی اور خودغرضی نے لے لی تھی سائنسی دنیا میں فرد کی بے بسی، فطری جذبات کی عدم تسکین اور اس قسم کے دیگر عناصر جن میں فرسودہ ادبی قدریں بھی شامل تھیں۔ کے خلاف بیزاری، نفرت اور بغاوت پیدا ہوگئی۔ حساس ذہن عقل محض سے تنگ آ چکے تھے اور ادیب وشاعر قدیم ادبی قدروں سے بیزار تھے۔ چنانچہ روسو نے اس تھکا دینے والی یکسانیت سے بیزار ہو کر رومانوی بغاوت کا علم بلند کیا۔ فرانس میں اس کے خیالات نے "انقلاب فرانس" کی صورت اختیار کر لی۔ اس بغاوت کی رو نے دوسرے ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اس طرح روسو کے خیالات کا یورپ کے ادیبوں اور شاعروں پر بڑا اثر ہوا۔ ولیم بلیک، کولرج، ورڈزورتھ، شیلے، بائرن، کیٹس اور والٹر اسکاٹ نے رومانوی ادب کا ڈول ڈالا۔ یہ لوگ ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جو تخیل میں آباد ہو، ایسی حسین وجمیل کائنات کی تخلیق کے آرزومند تھے جس میں ارض وسما کے سارے حسن مجتمع ہوں، ایسے ماحول کا خواب دیکھتے تھے جس میں محبت کی کارفرمائی ہو اور ایسی جنت نما دنیا کے متمنی تھے جس میں انسانی فرشتوں کی آبادی ہو۔ غرض رومانوی ادیب وشاعر نے قوت وحیات کے مجسمے تراشے، انہیں تابناکی وتابندگی کے پرچم عطا کیے۔ انھوں نے کبھی انسان کامل کے خواب دیکھے کبھی مافوق البشر کی تصویر سے اپنے آئینہ خانے سجائے، کبھی معیشت کے آگے مجبور انسان کی افسردگی اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنا لیا غرضیکہ مستند اور مسلمہ ادبی قدروں اور اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر فن کے وسیلے سے اظہار ذات کی تحریک شروع ہوئی۔

اردو میں رومانوی تحریک دراصل سرسید کے عقلیت پسند اور مقصدی ادب کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی۔ اس کا اظہار ان

ہی کے زمانے میں محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور حلیم شرر کی تحریروں میں ہوا۔ بعد ازاں اس تحریک کے فروغ کے نت نئے سامان فراہم ہو گئے پہلی جنگ عظیم کے بعد غیر منقسم ہندوستان میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جنھوں نے اس طرز خیال کو تقویت دی۔ علی گڑھ تحریک کے مقصدی ادب کی بے نمکی، غزل میں روایات کی موجودگی، انگریزی ادب کا براہ راست مطالعہ، جنگ کے دوران اہل ہند کا برطانیہ سے ربط و ضبط، جنگ کے بعد افسردگی، فراریت اور عیش کوشی کی فضا۔ ان سارے عوامل نے رومانوی ادب کو فروغ دیا۔

برصغیر میں اس تحریک کے فروغ پانے کی سیاسی وجہ بھی تھی۔ ایک طرف انگریزی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ شدت کے ساتھ دلوں میں موجزن تھا، دوسری طرف اپنی مرضی کے خلاف ہندوستانی سپاہی انگریزی سلطنت کے تحفظ و بقاء کی خاطر میدان جنگ میں جانوں کی بازی لگا رہے تھے یہ جبر اور مجبوری دلوں میں آگ بھڑکا رہی تھی۔ جنگ کی خونریزی و تباہ کاری کے نتیجے میں گرانی پیدا ہو گئی تھی جس نے زندگی کو دشوار تر بنا دیا تھا علاوہ ازیں، برصغیر کے ہزاروں ہزار افراد بلا کسی مقصد کے جنگ میں مارے گئے، زخمی ہوئے اور صعوبتوں میں مبتلا ہوئے۔ اس تلخ اش حقیقت نے ہندوستانیوں کے دل توڑ دیئے۔ محرومی، غم و غصہ اور رنج و حرماں ان کا نصیبہ بن گیا۔ ان غم انگیز حالات میں زندگی سے فرار اور ذہنی سکون کی تلاش شروع کر دی۔ چنانچہ ادب میں یہ رجحان رومانیت کے فوری فروغ کا سبب بنا۔

اس تحریک کو کئی غیر متوقع وسائل سے بھی مدد ملی۔ اس ضمن میں ٹیگور کی ماورائیت، اقبال کی روایت شکنی اور ابوالکلام آزاد کے شوکت پارینہ کے خواب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جنگ عظیم کے نتیجے میں قومی تحریک بھی بڑے زور و شور سے شروع ہوئی۔ دوسرے ممالک کی آزادی کی تحریکوں کا مطالعہ کیا گیا۔ انگریزوں کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادبیات کے مطالعہ پر توجہ دی گئی اور ان سے اخذ و استفادے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں رومانیت کی ابتداء انگریزی کی بجائے ترکی تراجم سے ہوئی۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی ادبیات پر خصوصی توجہ دی۔ ترکی میں رومانیت کا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ اسے اردو میں منتقل کیا گیا۔ نئے خیالات، نئے اسالیب اور نئے الفاظ و تراکیب نے ذہنی ساخت پر گہرا اثر ڈالا۔

یلدرم کے دوش بدوش رومانی نثر نگاروں کی کھیپ کی کھیپ سامنے آتی ہے جن میں خلیقی دہلوی، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، آل احمد، مہدی الافادی، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار نے اپنے افسانہ و مضمون سے اس تحریک کو جلا بخشی۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے رومانوی اثرات سب سے پہلے اقبال کے یہاں نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں بعض ایسی نمایاں خصوصیات موجود ہیں جو ان کی رومانیت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ عقل سے بیزاری، عشق و وجدان سے لگاؤ، قرون اولیٰ کے مسلمانوں سے اثر پذیری، قرون وسطیٰ کا پرشکوہ پس منظر اور فطری حسن کی عکاسی انہیں رومانیت سے بہت قریب لے آتی ہے۔

اقبال کے بعد رومانی رجحانات کوفروغ دینے میں جوش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، عظمت اللہ خان، روش صدیقی، ساغر نظامی، حامداللہ افسر وغیرہ کے نام خاصے نمایاں ہیں۔

اس تحریک نے تنقید نگاری پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ رومانوی تنقید نے ادب کو محض سماجی مفاہیم اور افکار کا ذریعہ نہیں سمجھا تھا بلکہ اس کے حسن اور جمالیاتی کیف پر زور دیا تھا رومانی تنقید نتیجۂ خودفراموشی اور حسن نگارش کی پرستش کا مظہر بن گئی اور نقاد کا مقصد تنقید سے زیادہ توصیفی وتشریحی بنا۔ اس تحریک کے اہم نقادوں میں عبدالرحمان بجنوری، مہدی افادی، نیاز فتحپوری، عبدالماجد دریا بادی، مجنوں گورکھپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رومانوی تحریک کوفروغ دینے میں ''مخزن'' ''رومان'' اور ''ہمایوں'' نے بھی اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان رسائل میں جن لکھنے والوں کے ہاتھوں یہ تحریک پروان چڑھی ان میں اقبال، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، یلدرم، فلک پیما، شیخ عبدالقادر، اختر شیرانی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو ایک خاص قسم کے حسن ولطافت سے آشنا کیا اور پرزور متخیلہ کے بل بوتے پر رومانوی تحریک کو فروغ دینے کی جدوجہد کی۔

المختصر، رومانوی تحریک نے سرسید کی اصلاحی تحریک کی پیدا کردہ عقلیت اور جذبات کے فقدان پر ایک کاری ضرب لگائی اور شدید جذباتیت داخل کر کے آئندہ کے لیے متوازن نقطہ نظر اختیار کرنے کی راہیں کھول دیں۔ اس نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرایا کہ ادب آلہ اشاعت نہیں، جذبات کی آسودگی کی ایک اہم ضرورت بھی ہے۔ اسی تحریک کا فیضان ہے کہ اردو شعروادب بہت سے نئے اسالیب وآہنگ سے آشنا ہوا لیکن اسی تحریک کو آگے چل کر ردعمل کا سامنا کرنا پڑا جس نے نئی شکل اختیار کی۔ داخلی تجربے کی لگن اور جذبات کی رو نے اپنے لیے دو راستے نکالے۔ ان میں ایک حلقہ ارباب ذوق کی سمت مڑ گیا اور دوسرا ترقی پسند مصنفین کی صفوں کی جانب چلا گیا۔

## ۲۔ کتابیات

نوٹ آپ مندرجہ ذیل کتب ورسائل کی مدد سے رومانوی تحریک کا تفصیلی مطالعہ فرمائیں۔

### لازمی:


۱۔ ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں'' کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء

۲۔ ڈاکٹر محمد حسن ''اردو ادب میں رومانوی تحریکیں'' لاہور، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز

۳۔ پروفیسر محمد احسان الحق ''اصول تنقید'' لاہور، علمی کتب خانہ
۴۔ پروفیسر جمیل احمد انجم ''اردو ادب'' لاہور، علمی کتب خانہ
۵۔ رشید امجد، فاروق علی (مرتبین) ''پاکستانی ادب''
(پانچویں جلد) راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج ۱۹۸۲ء
۶۔ مرزا ادیب (ایڈیٹر) ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور، اپریل ۱۹۵۴ء
۷۔ رحمٰن پاشا، مشفق خواجہ، آمنہ مشفق (مرتبین) ''تخلیقی ادب''
(شمارہ ۱) عصری مطبوعات، کراچی ۱۹۸۰ء

## امدادی:

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کراچی نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۷۷ء
۲۔ محمد ھادی حسین ''مغربی شعریات'' لاہور، مجلس ترقی ادب ' ۱۹۶۸ء
۳۔ کشن پرشاد کول ''نیا ادب'' کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان پہلا ایڈیشن
۴۔ A.J. Wxatt
The History of English
Literature, Oxford, 1918.
۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''تنقیدی زاویے'' لاہور، مکتبہ اردو ' ۱۹۵۱ء
۶۔ پروفیسر وقار عظیم ''نیا افسانہ'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۷ء

## ۳۔ تفصیلی مطالعہ

نوٹ: رومانوی تحریک کے تفصیلی مطالعے کے لیے مندرجہ ذیل کتب و رسائل کے متعلقہ حصے ملاحظہ فرمائیں۔

### ۱۔ رومانوی تحریک کا خاکہ

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں، صفحات ۱۰۴ تا ۱۰۶
ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک، متعلقہ صفحات

ج۔ اصول تنقید' صفحات ۱۸۵ تا ۱۸۸

د۔ History of English Literature صفحات ۱۴۷ تا ۱۴۹

ر۔ مغربی شعریات' صفحات ۲۹۱ تا ۳۰۱ ۔ ۳۰۳ تا ۳۰۹

س۔ ارسطو سے ایلیٹ تک' صفحہ ۳۰۷

ص۔ نیا ادب ' صفحہ ۳۶

## ۲۔ مغربی ادب کی رومانوی تحریک

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۷

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک ' متعلقہ صفحات

ج۔ تخلیقی ادب ' صفحات ۱۵۹ تا ۱۸۵

د۔ پاکستانی ادب 'صفحات ۱۱۲ تا ۱۱۷

ر۔ History of English Literature صفحات ۱۴۷ تا ۱۴۹

## ۳۔ اردو میں رومانوی تحریک کا آغاز

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں' صفحات ۴۳۸ تا ۴۴۴

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک 'متعلقہ صفحات

ج۔ پاکستانی ادب' صفحہ ۳۵۷

د۔ اردو ادب ' صفحات ۱۶۲ تا ۱۶۴

## ۴۔ رومانوی تحریک کے ادباء

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں صفحات ۴۴۹ تا ۴۶۱

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک' متعلقہ صفحات

ج۔ اردو ادب' صفحات ۱۶۴ تا ۱۶۸

د۔ ادب لطیف ،صفحات ۵ تا ۸

ر۔ تنقیدی زاویے،صفحات ۲۴۶ تا ۲۵۰

س۔ نیا افسانہ،صفحات ۲۶ تا ۲۹

## ۵۔ رومانوی تحریک کے شعرا

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں،صفحات ۴۶۱

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک،متعلقہ صفحات

ج۔ اردو ادب ،صفحات ۱۶۹ تا ۱۷۱ (پہلے پیراگراف تک)

د۔ تنقیدی زاویے صفحات ۳۰۸ تا ۳۱۱

## ۶۔ رومانوی تحریک کے تنقید نگار

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں،صفحات ۴۷۲ تا ۴۷۸

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک،متعلقہ صفحات

ج۔ اردو ادب،صفحات ۱۷۱ تا ۱۷۲ ۔ ۲۹۵ تا ۲۹۶

## ۷۔ اردو ادب پر رومانوی تحریک کے اثرات

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں،صفحات ۴۷۸ تا ۴۸۱

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک،متعلقہ صفحات

ج۔ ادب لطیف ۔صفحہ ۸ (آخری پیراگراف)

د۔ اردو ادب ،صفحہ ۱۷ (دوسرا پیراگراف)

## ۸۔ رومانوی تحریک کے خلاف ردعمل

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں، صفحات ۴۸۲ تا ۴۸۴

ب۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک، متعلقہ صفحات

ج۔ اردو ادب، صفحہ ۱۷۲ (آخری پیراگراف)

د۔ پاکستانی ادب ، صفحات ۳۶۷ تا ۳۶۸

ر۔ نیا افسانہ ، صفحات ۶۴ تا ۶۶

# ۴۔ خود آزمائی

۱۔ رومانوی ادب حسن و عشق کے تذکرے کا نام نہیں، ایک مخصوص طرز فکر اور زاویہ نگاہ ہے۔ اس کلیے پر بحث کیجئے۔

۲۔ یورپ میں اس تحریک کے پیدا ہونے کے اسباب و عوامل پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ اردو ادب میں اس تحریک کے نمو پانے کی جو وجوہات کارفرما تھیں، ان کی نشاندہی کیجئے۔

۴۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق فرمائیں گے کہ ٹیگور کی ماورائیت، اقبال کی روایت شکنی اور ابوالکلام آزاد کے شوکت پارینہ کے خواب سے اردو میں رومانوی تحریک کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

۵۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ''مخزن'' اور اس نوع کے دیگر رسائل نے رومانوی ادب کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے؟ اپنی رائے دیجئے۔

۶۔ رومانوی تحریک کے ادیبوں اور ان کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

۷۔ اردو کے کن کن شاعروں نے رومانوی تحریک کے اثرات قبول کیے اور اس کے نتیجے میں کس قسم کی شاعری ظہور میں آئی؟ اجمالی جائزہ لیجئے۔

۸۔ اردو میں رومانوی تنقید کن نقادوں کے ہاتھوں پروان چڑھی اور ان کی بدولت کس نوع کی تنقید نگاری وجود میں آئی؟ سیر حاصل بحث کیجئے۔

۹۔ رومانوی تحریک کے زیر اثر اردو زبان اور ادب پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے، ان کا تعین کیجئے۔

۱۰۔ اس تحریک کا ردعمل کن صورتوں میں رونما ہوا اور اس کے کیا اسباب و عوامل تھے؟ مدلل جواب دیجئے۔

یونٹ ۵۔۶

# ترقی پسند تحریک

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کا تعارف اور مقاصد | 37 |
| ۱۔ | ترقی پسند تحریک کا پس منظر | 38 |
| | ۱.۱ مجوزہ کتب | 39 |
| | ۱.۲ خود آزمائی | 40 |
| ۲۔ | ترقی پسند تحریک کا قیام، منشور اور مقاصد | 40 |
| | ۲.۱ مجوزہ کتب | 42 |
| | ۲.۲ خود آزمائی | 42 |
| ۳۔ | ترقی پسند تحریک کا فروغ اور مشہور مصنفین | 43 |
| | ۳.۱ مجوزہ کتب | 45 |
| | ۳.۲ خود آزمائی | 46 |
| ۴۔ | اردو ادب پر تحریک کے اثرات | 46 |
| | ۴.۱ مجوزہ کتب | 49 |
| | ۴.۲ خود آزمائی | 49 |
| ۵۔ | ترقی پسند تحریک کے خلاف ردعمل (محاسن و مصائب) | 49 |
| | ۵.۱ مجوزہ کتب | 51 |
| | ۵.۲ خود آزمائی | 51 |
| ۶۔ | مزید مطالعے کے لیے کتب و مضامین کی اضافی فہرست | 52 |

# یونٹ کا تعارف اور مقاصد

عزیز طلبا و طالبات:

مطالعاتی رہنما نمبر ا (اردو ادب کا سیاسی و سماجی پس منظر) میں ترقی پسند تحریک کے بارے میں مختصر طور پر کچھ پڑھ چکے ہیں۔ ان یونٹوں میں آپ اس تحریک سے قدرے تفصیلی طور پر متعارف ہوں گے۔ ترقی پسند تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت آپ درج ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھیں:

۱۔ ترقی پسند تحریک کے تاریخی پس منظر کو سمجھ سکیں اور اسے بیان کر سکیں۔

۲۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت جو افکار عام ہوئے ان کا جائزہ لے سکیں۔

۳۔ ترقی پسند تحریک کے اکابرین سجاد ظہیر، محمود الظفر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور دوسرے متعلقہ لوگوں کی کوششوں سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی تصانیف میں ان افکار کی نشاندہی کر سکیں۔

۴۔ اردو ادب پر اس تحریک کے اثرات کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

۵۔ اس تحریک کے خلاف ردعمل کی مختلف صورتوں پر تنقیدی نظر ڈال سکیں۔

## ۱۔ ترقی پسند تحریک کا پس منظر:

کسی عظیم ادبی تحریک کے قیام میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، دو + دو کے طریقے پر ان کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ تاہم ترقی پسند تحریک کے قیام کے پس منظر کا جب بھی ذکر ہوگا تو درج ذیل اہم واقعات و تحریکات کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

۱۔ علی گڑھ تحریک و تحریک انجمن پنجاب

۲۔ ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس

۳۔ ۱۹۳۶ء سے قبل ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات

علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں کون سے افکار عام ہوئے اس کا تفصیلی ذکر آپ یونٹ نمبر ۱ اور ۲ میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس تحریک نے ادب کو کسی نہ کسی مقصد کے تابع بنانے کی کوشش کی۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے اشتراکیت، محنت اور سرمائے کے موضوعات پر اہل فکر کی توجہ مرکوز کرنا شروع کی۔ لینن اور مارکس کے نظریات عام ہونا شروع ہوئے۔ روسی ادیبوں کے زیر اثر ادب وفن کی دنیا میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ مجموعی طور پر جو افکار عام ہوئے، وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ مذہب باطل ہے اور اس کی حیثیت افیون کی ہے۔

۲۔ معاش انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

۳۔ پرانی روایتوں، قدروں اور تہذیب وثقافت کی نفی لازمی ہے۔

۴۔ مذہب کی بنیاد پر تفریق باطل ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے اور ادیب کا کام انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔

۵۔ حقیقت نگاری کے ذریعے معاشرے کی تصویر کشی ادب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس انجمن کے قیام سے پیشتر تین ایسے ادب پارے شائع ہو چکے تھے جو اپنے اندر اس انجمن کے قیام اور اس تحریک کے آغاز کے لیے جراثیم رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک تو پریم چند کا افسانہ 'کفن' دوسرا چند افسانوں کا مجموعہ 'انگارے'☆ اور تیسرا احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' تھا۔

## ۱.۱ مجوزہ کتب

انجمن ترقی پسند مصنفین کے پس منظر کے تفصیلی مطالعے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے:

۱۔ ڈاکٹر انور سید: اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک) کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۴۸۲۔۴۸۳

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، دسویں جلد، ۱۹۱۴۔۱۹۷۲ء

(حصہ اول) پہلا باب و دوسرا باب، صفحات ۱۔۵۴

(حصہ دوم) تیسرا باب، ص ۴۳۵۔۴۶۳

---

☆ انگارے سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانوں پر مشتمل تھا۔ افسانوں کی کل تعداد آٹھ تھی، یہ کتاب اشاعت کے فوراً بعد ضبط کر لی گئی۔

۳۔ سجاد ظہیر: روشنائی مع دیباچہ از سبط حسن، کراچی مکتبہ دانیال۔جنوری ۱۹۸۶ء

۴۔ سردار جعفری: ترقی پسند ادب، علی گڑھ انجمن ترقی اردو ہند، بار دوم، ۵۷ء تیسرا اور چوتھا باب، صفحات ۹۵ تا ۱۸۰

۵۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء صفحات ۱۷۷۔ ۱۸۲

## ۱.۲ خود آزمائی

۱۔ ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے طور پر کارفرما عناصر پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

۲۔ کیا ترقی پسند تحریک کا قیام سراسر غیر ملکی نظریات کے اثرات کا نتیجہ تھا؟ وضاحت کیجئے۔

## ۲۔ ترقی پسند تحریک کا قیام، منشور اور مقاصد

گزشتہ صفحات میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے پس منظر پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔اسی پس منظر کی روشنی میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ انجمن ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر کا نام اساسی حیثیت رکھتا ہے۔دوسرے لوگوں میں احمد علی، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گوش، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر تاثیر، محمود الظفر، رشید جہاں، منشی دیانرائن اور فیض احمد فیض کے نام قابل ذکر ہیں۔ان لوگوں نے تحریک کے ابتدائی دور میں اسے متعارف کرانے کے سلسلے میں نہایت محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدائی منصوبہ بندی اور قیام کے سلسلے میں مختلف آرا موجود ہیں۔پروفیسر احمد علی بھی انجمن کا ابتدائی لائحہ عمل مرتب کرنے کے دعویدار ہیں (*)۔ تاہم سجاد ظہیر کے خیال کے مطابق اس ادبی تنظیم کا منصوبہ ۱۹۳۵ء میں لندن کے ناکنگ ریستوران میں بنا اور ایک مختصر سا منشور بھی تیار ہوا جس کی نقلیں برصغیر کے بعض ادیبوں کو بھیجی گئیں۔لندن میں جن لوگوں نے انجمن کا اولین منشور تیار کیا، ان میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر شریک تھے۔سجاد ظہیر

---

(*) ملاحظہ ہو "تحریک ترقی پسند مصنفین اور تحقیقی مصنف" احمد علی، مطبوعہ سیپ شمارہ ۔ ۴

۱۹۳۵ میں جب لندن سے ہندوستان آئے تو یہاں کے ادیبوں کے ساتھ مل کر انجمن کی با قاعدہ تشکیل کے لیے کوششیں شروع کیں، تا آنکہ اپریل ۱۹۳۶ میں وہ لکھنو میں ایک کل ہند کانفرنس کے انعقاد میں کامیاب ہو گئے مگر اس سے پہلے الہ آباد، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد (دکن) اور لاہور جیسے شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔

انجمن کی اس پہلی کانفرنس کی صدارت اردو ہندی کے مشہور ادیب منشی پریم چند نے کی۔ اس کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ (منشور) منظور ہوا [۱]۔ بطور صدر کانفرنس منشی پریم چند کے خطبہ صدارت کے درج ذیل اقتباسات ترقی پسند مصنفین کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔[۲]

الف۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

ب۔ ادب آرٹسٹ کے ذہنی توازن کی ظاہری صورت ہے۔ اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔

اس تحریک کے نمایاں مقاصد درج ذیل تھے۔

۱۔ ادب کو زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیئے۔

۲۔ ادب کو سچائی، حسن، صداقت اور عقلی صداقتوں کا ترجمان ہونا چاہیئے۔

۳۔ ادب کو انسانیت کا ترجمان اور انسانوں کا ہمدرد اور غم گسار ہونا چاہیئے۔

۴۔ ادب کو آزادی اور ترقی کی قوتوں کا موید اور حامی ہونا چاہیے۔ اور جبر، استحصال اور غلامی کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے۔

۵۔ ادب میں نئے امکانات کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہیے۔ اسے اسلوب، ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے جدت کا ہم نوا ہونا چاہیئے۔

## ۱.۲۔ مجوزہ کتب


۱۔ ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب کی تحریکیں، صفحات ۴۸۳_۴۹۳

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، دسویں جلد، ص ۴۳۸

۳۔ سجاد ظہیر: روشنائی، کراچی، مکتبہ دانیال جنوری ۱۹۸۶ء، صفحات ۱_۱۲۸


---

(۱) اردو ادب ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک' از ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۶۷ء ص ۔ ۱۸۱

(۲) اعلان نامے کے متن کے لیے ملاحظہ ہو ترقی پسند ادب از سردار جعفری ۱۹۵۷ء ص ۲۱_۲۲

۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: اردو ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک لاہور مکتبہ ءخیابان ادب صفحات ۱۸۰۔۱۸۱

۵۔ علی سردار جعفری: ترقی پسند ادب، علی گڑھ انجمن ترقی اردو ۱۹۵۷ء صفحات ۱۸۱۔۱۸۴

## ۲.۲۔ خودآزمائی

۱۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں ناکنگ ریستوران تا پہلی کل ہند کانفرنس منعقدہ لکھنو کی تفصیلات بیان فرمائیں۔

۲۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس منعقدہ لکھنو کے منشور کی روشنی میں انجمن کے کون سے مقاصد نمایاں ہوتے ہیں۔

## ۳۔ ترقی پسند تحریک کا فروغ اور مشہور مصنفین

ترقی پسند تحریک کے عموماً تین ادوار متعین کیے جاتے ہیں۔

### پہلا دور:

ناکنگ ریستوران لندن کے اعلان نامے سے سجاد ظہیر کی گرفتاری تک

(۱۹۳۵ء۔۱۹۴۰ء)

### دوسرا دور:

سجاد ظہیر کی رہائی سے قیام پاکستان تک (۱۹۴۲ء ۔ ۱۹۴۷ء)

### تیسرا دور:

طلوع آزادی سے سیاسی پابندی تک (۱۹۴۷ء ۔ ۱۹۵۲ء)

ترقی پسند تحریک کا پس منظر، اس کی ابتدا اور پہلی کل ہند کانفرنس کا مختصر ذکر آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک فعال حیثیت اختیار کر گئی اور اس کی بدولت ملک کی ادبی فضا میں ایک زبردست تحرک پیدا ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء تک ترقی پسند

تحریک نے لاہور، لکھنو اور حیدرآباد میں اپنے مراکز قائم کر لیے۔ تحریک کے نظریات کو فروغ دینے کے لیے ایک انگریزی سہ ماہی رسالہ ''نیو انڈین لٹریچر'' جاری کیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی جس کا افتتاحی خطبہ رابندر ناتھ ٹیگور نے تحریر کیا۔ آغاز ہی میں تحریک کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تحریک کے ایک سرگرم رکن پروفیسر احمد علی اس سے الگ ہو گئے مگر اس کے باوجود تحریک نے اپنے نظریات کی تبلیغ اور مقاصد کے حصول کی کوشش جاری رکھی اور ملک میں ادیبوں اور شاعروں کی کثیر تعداد اس کی ہم نوا بن گئی تحریک کے آغاز میں جن ادیبوں نے اس تحریک کو اپنایا، ان میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سبط حسن، سلام مچھلی شہری، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی۔ اختر انصاری، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، اسرار الحق مجاز، معین احسن جزبی اور احمد ندیم قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔(*)

ترقی پسند تحریک کے پہلے دور میں بعض سیاسی وجوہات کی بنا پر تحریک کے راہنماؤں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور عبدالعلیم وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا اور یہ تحریک قدرے تعطل کا شکار ہو گئی۔

سجاد ظہیر ۱۹۴۲ میں قید سے رہا ہوئے اور اس تحریک کو دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا اور اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس تحریک میں ہر قسم کے نظریات کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۴۲ میں دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد کی گئی تو اس میں تحریک سے غیر متفق ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ یوں بھی ایسے ادیبوں کی تعداد کم نہ تھی جو تحریک کے مارکسی پروگرام سے نا متفق تھے۔ مگر تحریک جس معاشی اور معاشرتی انصاف اور انسان دوستی کی اشاعت کر رہی تھی اس کے حامی تھے۔ اس کانفرنس نے تحریک کو دوبارہ زندہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ترقی پسند نظریات کی اشاعت کے لیے ''نیا زمانہ''، ''نیا ادب'' اور ''قومی جنگ'' جیسے رسائل جاری ہوئے۔

ترقی پسند تحریک کے دوسرے دور میں شہر بمبئی تحریک کا اہم مرکز بن گیا اور چوتھی کل ہند کانفرنس اسی شہر میں منعقد ہوئی اس کانفرنس نے ترقی پسند ادیبوں کو آزادی، مساوات اور انسان دوستی کے عقیدے میں کامل یقین اور اس کی اشاعت کا مشورہ دیا۔ اس عہد میں اردو شاعری، افسانہ اور تنقید کے ذریعے ترقی پسند نظریات کی تشہیر کی گئی اور ''ادب لطیف'' لاہور، ''ساقی'' دہلی اور ''نظام'' بمبئی نے ترقی پسند ادب کی تخلیقات کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ اس دور کے ترقی پسند ادب میں نعرہ بازی کا عنصر نسبتاً زیادہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کا تیسرا دور آزادی کے بعد شروع ہوا۔ ترقی پسند تحریک اگرچہ ادبی تحریک تھی لیکن اس پر شروع ہی سے سیاست کا غلبہ رہا۔[1]

پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس ۱۹۴۷ء اور دوسری ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں علاوہ اور باتوں کے

---

(*) ترقی پسند ادیبوں کی فہرست خاصی طویل ہے ناموں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اردو ادب کی تحریکیں' از انور سدید' صفحات (۴۹۳۔۵۵۳)

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''ترقی پسند تحریک اپنے آئینے میں'' از ڈاکٹر وحید قریشی، مطبوعہ ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور نومبر ۶۹ء تا مئی ۱۹۷۰ء تک کے پرچے۔

نظام سرمایہ داری کو توڑنے اور اشتراکی نظام کے نیام کی مہم کو تیز کرنے کا عہد کیا گیا۔اب انجمن کے منشور میں بعض ایسے پہلو شامل ہونے لگے کہ حکومت اسے سیاسی جماعت قرار دینے پر مجبور ہو گئی۔اس صورت حال کے نتیجے میں متعدد ادیب اس سے الگ ہو گئے۔ حکومت نے ''سویرا'' ''نقوش'' اور ''ادب لطیف'' جیسے رسائل پر جو تحریک کے ترجمان تھے، پابندی لگا دی۔۱۹۵۲ میں کراچی میں ترقی پسند مصنفین کی ایک اور کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت مولوی عبدالحق نے کی۔کانفرنس میں اس نکتے پر زور دیا گیا کہ یہ انجمن ایک ادبی تحریک ہے مگر اس کے باوجود ۱۹۵۳ء میں یہ انجمن خلاف قانون قرار دے دی گئی اور اس کی ہر طرح کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔

## ۳.۱ مجوزہ کتب

۱۔ ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۹۰۔۵۱۹

۲۔ سجاد ظہیر: روشنائی، اول تا آخر

۳۔ سردار جعفری: ترقی پسند ادب، ص ۱۸۱۔ ۲۳۵

## ۳.۲ خود آزمائی

۱۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

۲۔ کیا ترقی پسند تحریک سراسر سیاسی تحریک تھی؟ تائید یا تردید کیجیے۔

۳۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے کیا اسباب تھے؟ وضاحت کیجیے۔

## ۴۔ اردو ادب پر تحریک کے اثرات

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک اردو ادب کی دوسری بڑی تحریک تھی جس کے منظم، فعال اور موثر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔اس کے پس منظر میں ایک واضح نصب العین اور منصوبہ بندی موجود تھی، چنانچہ اس کے نتیجے میں ادب میں مباحث پیدا ہوئے اور یہ تحریک زندگی پر بھی اثر انداز ہوئی۔اس تحریک نے منطقی استدلال اور حقیقت پسندانہ تجزیے کی روش عام کی،

معاشی حقائق کا احساس دلایا اور استحصالی قوتوں کی نشان دہی کی ۔اردو ادب کی تمام اصناف ، بالخصوص شاعری، افسانے اور تنقید کو اس تحریک نے بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ذیل میں ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

**(الف) اردو شاعری:** جیسا کہ آغاز میں بتایا جا چکا ہے، ترقی پسند ادب کی اولین روایت علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب کی تحریکوں میں پڑی اور ان تحریکوں سے منسلک ادیبوں نے ادب کو مختلف مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی بنیاد ڈالی۔

جوش ملیح آبادی کو اس حد تک ترقی پسند کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں انقلاب کا نعرہ لگایا اور فرد کو موجودہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا مشورہ دیا۔جوش کے بعد فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے بڑے اہم شاعر ہیں جن کی نظموں میں ترقی پسند نظریے کا شعور واضح انداز میں موجود ہے۔فیض کی شاعری میں موجودہ نظام کو بدلنے کی خواہش حقیقت نگاری اور سیاسی شعور کے اشارے جا بجا نظر آتے ہیں۔علی سردار جعفری کے ہاں اشتراکیت کا پرچار نظر آتا ہے۔مخدوم محی الدین نے ترقی پسند تحریک کے سیاسی رخ کو اہمیت دی۔اسرار الحق مجاز ظالم سماج کے خلاف شکوہ بہ لب ہے اور عوام کے ساتھ مل کر انقلاب کا نعرہ لگاتا ہے کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی کا شمار ایسے ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے موجودہ نظام کی جبریت کے خلاف نعرہ لگایا اور شاعری کو نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور عارف عبدالمتین وغیرہ کے ہاں بھی اپنے اپنے انداز میں ترقی پسند نظریات کا پرچار نظر آتا ہے۔علی سردار جعفری کی نظم ''خون کی لکیر''، احمد ندیم قاسمی کی ''ایشیا جاگ اٹھا'' اختر الایمان کی ''تاریک سیارہ'' فیض کی ''مجھ سے پہلی سی محبت'' اور ''رقیب سے'' ساحر کی ''پرچھائیاں'' اور ''تاج محل'' اس سلسلے کی قابل ذکر نظمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔مجموعی طور پر ترقی پسند شاعری میں زندگی کے خارجی پہلوؤں کو موضوع بنانے اور قاری کو براہ راست مخاطب کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔

**(ب) ترقی پسند افسانہ:** اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے کہ دس افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، ترقی پسند نظریات کا حامل تھا مگر اس سے بھی پہلے پریم چند نے افسانہ ''کفن'' لکھ کر اردو افسانے میں حقیقت پسندی کی بنیاد قائم کر دی تھی بعد کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی اور قدرے مختلف رنگ میں سعادت حسن منٹو کا نام قابل ذکر ہے۔[1] ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو سماجی اعتبار سے حقیقت پسندی کی طرف مائل کیا اور نثر کی اس صنف کو مقصدیت کا آلہ کار بنانے کی کوشش کی۔ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے عہد کے دکھوں پریشانیوں، طبقاتی کش مکش اور جہالت وغیرہ کو براہ راست اردو افسانے کا موضوع بنایا۔

---

(۱) دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''اردو ادب'' صفحات ۲۱۹۔۲۲۱ اور ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' صفحات ۵۲۲۔۵۲۹

یوں ترقی پسند افسانے میں خارجی زندگی کا گہرا مشاہدہ پیش کیا گیا۔اگر یہ کہا جائے کہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو عالمی معیار تک پہنچا دیا تو غلط نہ ہو گا۔کرشن چندر کا افسانہ"ان داتا"، زندگی کے موڑ پر، کالو بھنگی، کچرا بابا، منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، موذیل اور احمد ندیم قاسمی کا ماما، ثواب اور بیشر سنگھ اس دور کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ترقی پسند ناول نگاروں میں پریم چند کا "گئودان" عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر" ابراہیم جلیس کا "چور بازار" خدیجہ مستور کا "آنگن" اور شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" قابل ذکر ہیں۔

**(ج) ترقی پسند تنقید:** ترقی پسند نقادوں نے اپنے انداز میں تنقید کا مواد مارکس، لینن اور گورکی وغیرہ کے نظریات سے حاصل کیا۔انہوں نے ادب کا تجزیہ سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں یوں کیا کہ اس کی افادی حیثیت بھی ملحوظ خاطر رہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تنقید کا اولین اہم نام ہے۔ان کا مقالہ "ادب اور زندگی" ترقی پسند تحریک کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔اختر رائے پوری نے اردو تنقید کی پہلی مرتبہ مارکسی نظریات سے آگاہ کیا اور اردو تنقید کو ایک نئے رخ سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔دیگر ترقی پسند نقادوں میں سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر عبدالعلیم، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، علی سردار جعفری، ممتاز حسین، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ظ۔انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ان تمام نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں اردو میں ترقی پسند تنقید کو فروغ دیا۔

ترقی پسند تنقید کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں ادب پارے کو مارکسی نظریے کے اصولوں کے مطابق پرکھا جاتا ہے اس انداز تنقید کے مطابق ہر وہ فن پارہ جو زندگی کے ارتقاء میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے ترقی پسند فن پارہ کہلا سکتا ہے۔تنقید نگاری کے اس انداز نے ادب میں حقیقت بیانی اور صاف گوئی کا رجحان پیدا کیا۔

## ۱.۴ مجوزہ کتب

۱۔ انور سدید: اردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۲۲۔۵۵۰

۲۔ سردار جعفری: ترقی پسند ادب، ص ۲۳۶۔۲۶۸

۳۔ عزیز احمد: ترقی پسند ادب، کاروان ادب ملتان صدر ۱۹۸۶ء ص ۸۸۔۱۶۲

## ۲.۴ خودآزمائی

۱۔ ترقی پسند شعرا نے شاعری کو عوام کی زندگی کا ترجمان بنایا اور شاعری کا رشتہ زندگی سے جوڑا۔ تائید یا تردید کیجئے اور مثالیں بھی دیجئے۔

۲۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اردو افسانے میں کون سی مثبت تبدیلیاں پیدا کیں۔ وضاحت کیجئے۔

۳۔ ترقی پسند تنقید کا موازنہ تنقید کے دیگر دبستانوں سے اس طرح کیجئے کہ اس انداز تنقید کی خوبیاں اور خامیاں واضح ہو سکیں۔

## ۵۔ ترقی پسند تحریک کے خلاف ردعمل (محاسن و معائب)

ترقی پسند تحریک نے خارج کی عکاسی اور مادی وسائل کی فتح کا درس دیا، چنانچہ اس کے ردعمل کے طور پر ایک دوسری تحریک ابھری جس نے مادیت سے گریز اختیار کر کے روحانیت اور داخلی جذبات کے اظہار کو فروغ دیا۔ اس کا نام ''حلقہ ارباب ذوق'' تھا۔

ترقی پسند تحریک پر شروع ہی سے اشتراکی خیالات کا حامل ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ الزام کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا کیونکہ خود تحریک کے بانی سجاد ظہیر اشتراکی خیالات کے زبردست حامی تھے۔ اسی بنا پر اس تحریک کو ادبی سے زیادہ سیاسی تحریک قرار دیا گیا اور یہ الزام لگایا گیا کہ اس تحریک کے زعما ادب کے پردے میں اپنے مخصوص سیاسی نظریات کا پرچار کرتے ہیں۔ سیاسی جھکاؤ کے باعث یہ تحریک مختلف حکومتوں کی طرف سے پابندیوں کی زد میں رہی اور بالآخر اس کی سرگرمیوں پر مستقل پابندی لگا دی گئی۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس تحریک نے اردو ادب کی مختلف اصناف کو بے حد متاثر کیا۔ اس تحریک نے عقلیت پسندی اور سائنسی شعور کو بیدار کیا اور ادب کو گرد و پیش کی فضا کی طرف متوجہ کیا اس طرح ادب نے زمین سے رشتہ جوڑا۔ ترقی پسند افسانے نے معاشرتی ناہمواریوں کو موضوع بنایا، شاعری میں اظہار کے مختلف وسیلے وضع ہوئے، زندگی کے جبر کو شعر کے ذریعے پیش کیا گیا۔ ترقی پسند انداز تنقید نے ادب میں صاف گوئی، حقیقت بیانی اور صداقت کو پیش کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک سے ادب و شعر پر چند منفی اثرات بھی پڑے جن میں سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ اس دوران تمام ادب ایک طرح کے پروپیگنڈے کی نذر ہو گیا اور اس میں تشہیر اور تبلیغ کے عناصر داخل ہو گئے ادب پر سیاست غالب آئی۔ مادیت پرستی کے باعث ادب میں روحانی مذہبی اور اخلاقی قدروں کا فروغ رک گیا۔ روایت شکنی کے شوق نے پرانے تہذیبی اور ادبی ورثے کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا۔

ترقی پسند تحریک کی جہت اپنے آغاز ہی سے اشتراکیت کی طرف مڑ گئی چنانچہ ابتدا ہی سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ تحریک میں سیاسی عناصر کے باعث احمد علی اس سے عملاً الگ ہو گئے۔ جن دیگر ادیبوں نے وقتاً فوقتاً ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں لکھا، ان میں پروفیسر حسن عسکری ممتاز شیریں، ن۔م راشد اور ڈاکٹر وحید قریشی کے نام قابل ذکر ہیں۔

## ۵.۱ مجوزہ کتب


۱۔ آل احمد سرور: ترقی پسند تحریک پر ایک نظر، مشمولہ انتخاب آل احمد سرور، لاہور اکیڈمی، صفحات ۳۲۴ ۔ ۳۴۹

۲۔ انور سدید: اردو ادب کی تحریکیں، صفحات ۵۱۹ ۔ ۵۵۳

۳۔ حسن عسکری: انسان اور آدمی، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۳

۴۔ سید عبداللہ: اردو ادب ۱۸۵۷ سے ۱۹۶۶ تک، صفحات ۱۷۵۔۲۸۰

۵۔ فیض احمد فیض: ادب کا ترقی پسند نظریہ، مشمولہ میزان، لاہور اکیڈمی ۱۹۶۵، صفحات ۱۱۔۲۴

۶۔ ممتاز شیریں: معیار، نیا ادارہ لاہور، صفحات ۱۳۹۔۱۴۷

۷۔ ن۔م راشد: ایک مصاحبہ مشمولہ انسان، المثال نیپئر روڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء صفحات ۱۔۱۲

۸۔ ڈاکٹر وحید قریشی: ترقی پسند تحریک اپنے آئینے میں مطبوعہ ہفت روزہ زندگی، لاہور، متعلقہ صفحات


## ۵.۲ خود آزمائی

۱۔ ترقی پسند تحریک نے کچھ بت توڑے ہیں مگر کچھ بنائے بھی ہیں۔ بحث کیجئے۔

۲۔ ترقی پسند ادب میں پروپیگنڈے کے عنصر نے اسے ادب کی سطح سے گرا دیا۔ تائید یا تردید کیجئے۔

# مزید مطالعے کے لیے کتب ومضامین کی اضافی فہرست


۱۔ ترقی پسند تحریک کا پس منظر: پروفیسر احمد علی، مطبوعہ افکار کراچی، مارچ ۷۴ء

۲۔ اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت: احتشام حسین، مشمولہ تنقیدی جائزے

۳۔ ترقی پسند تحریک: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''نقوش'' آزادی نمبر

۴۔ ترقی پسند ادب کے پچاس سال: شہزاد منظر، مطبوعہ ''اوراق'' سالنامہ، اکتوبر ۸۵ء

۵۔ آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری، ''نقوش'' جنوری/فروری ۸۶ء

۶۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک: حنیف فوق مشمولہ ''مثبت قدریں''

۷۔ ترقی پسند ادب: عزیز احمد

۸۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک: یونس جاوید

۹۔ نئے ادبی رجحانات: اعجاز حسین

یونٹ ۷۔۸

# حلقہ ارباب ذوق کی تحریک

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمان

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کے مقاصد | 55 |
| ۱۔ | موضوع کا تعارف | 55 |
| ۲۔ | کتابیات | 61 |
| ۳۔ | تفصیلی مطالعہ | 64 |
| ۴۔ | خودآزمائی | 67 |

# یونٹ کے مقاصد

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے دوران اس یونٹ کے درج ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھئے

تا کہ آپ

۱۔ تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب معلوم کر سکیں۔

۲۔ تحریک کے مختلف ادوار اور ان کی ادبی پیشکش کا جائزہ لے سکیں۔

۳۔ اس تحریک پر مولانا صلاح الدین احمد اور میراجی کے براہ راست اثرات کا مطالعہ کر سکیں۔

۴۔ یہ تحریک ادب برائے ادب کی ترجمان تھی۔ اس حقیقت کا تعین کر سکیں۔

۵۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا اور ان کے شعری کارناموں کا جائزہ لے سکیں۔

۶۔ حلقے کے افسانہ نگاروں اور ان کی افسانوی تخلیقات کا تجزیہ کر سکیں۔

۷۔ حلقہ ارباب ذوق کے تنقیدی مسلک پر ناقدانہ نظر ڈال سکیں۔

۸۔ اردو ادب پر اس تحریک کے دوررس اثرات کا تعین کر سکیں۔

## ۱۔ موضوع کا تعارف

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پہلے ذیل میں درج شدہ تعارف غور سے پڑھ لیجئے:

بیسویں صدی کی تیسری دھائی میں ترقی پسند تحریک نہایت شدومد کے ساتھ ابھری۔ اس نے ہنگامی موضوعات کو ادب کا پیش خیمہ بنایا، سماجی شعور پر زور دیا اور داخلیت اور انفرادی جذبے کو سرے سے ناپید کر دیا۔ اس نے ادب سے میکانیکی افادیت کا تقاضا کیا۔ مواد کو ہیئت پر اور نفس مضمون کو اسلوب پر ترجیح دی، جمالیاتی پہلو کے برعکس بیانات کی صداقت پر اصرار کیا۔ اس نے ادب کو یکسر سیاسی پروپیگنڈا بنا دیا۔ اس طرح تحریک کا تعلق عام انسانی قدروں سے قائم نہیں رہا۔ انتہا پسندی کے جوش میں ماضی سے رشتہ منقطع کرنے کا رجحان نمایاں ہوا۔

اس ادبی میلان کا ردعمل لازمی تھا جو حلقہ ارباب ذوق کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اگرچہ یہ تحریک ترقی پسندوں کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ کے طور پر نہیں ابھری تھی لیکن ادب برائے ادب کے حامی گروہ کے لیے یہ ایک ایسے پلیٹ فارم کی حیثیت اختیار کر گئی

جہاں سے ترقی پسند تحریک کے ہر حربے کی مدافعت کی گئی اور فکر وفن پر پڑنے والی ضرب کا مداوا کیا گیا۔ادب کے جملہ فنی لوازمات کو بروئے کار لانے کا سلسلہ قائم ہوا۔اس حلقے کے لکھنے والے یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے جو شعور کی بجائے تحت الشعور اور لاشعور پر اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔داخلیت پسندی اور دروں بینی ان کا طرہ امتیاز تھا۔

حلقہ ارباب ذوق اپنی ابتدائی صورت میں ''بزم داستان گویاں'' کے نام سے ۱۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو عالم وجود میں آیا۔لاہور کے چند ادیبوں کی بنائی ہوئی اس ادبی انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے جہاں افسانے پڑھے جاتے اور ان پر تنقید ہوتی۔آخر میں موجود شعراء اپنا کلام بھی پیش کرتے۔چند ہی ماہ بعد یہ بزم حلقہ ارباب ذوق کے نئے قالب میں ڈھل گئی اس کے جو اغراض ومقاصد طے کیے گئے ان میں نمایاں باتیں یہ تھیں کہ نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم وتفریح ہو،تنقید ادب میں خلوص اور بے تکلفی پیدا کی جائے اور اردو ادب کے ناسازگار ماحول کو صاف کیا جائے۔

ابتدائی دور میں یہ کوئی خاص تحریک نہیں بنی تھی۔لیکن میرا جی کی شمولیت کے بعد اس کے خدوخال میں تبدیلی نمایاں ہوئی۔ میرا جی ایک ذہین وفطین شخص تھے۔انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی شعراء کا بغور مطالعہ کیا تھا۔فرانسیسی شاعر بادیلیئر،میلارے اور امریکی ادیب وشاعر ایلن پو پر ان کے سیر حاصل مضامین شائع ہو چکے تھے۔بایں ہمہ،مشرقی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔اس طرح ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور تنقیدی تجربہ بھی وافر تھا۔چنانچہ اپنے تبحر علمی کی وجہ سے وہ حلقے پر پوری طرح چھا گئے اور ان کے زیر اثر یہ تحریک جدیدیت کی طرف نہایت تیزی سے گامزن ہو گئی۔صرف یہی نہیں،ترقی پسند تحریک کی مقصدیت کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کیا گیا اور خالص ادب کے فروغ کے لیے فن کے داخلی حسن کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی۔

مولانا صلاح الدین احمد بھی حلقہ ارباب ذوق پر اثر انداز ہوئے۔وہ مشرقی اقدار وروایات کے پاسدار تھے۔مشرقی ادب پر ان کی نظر گہری تھی۔ان کے اسلوب نگارش پر محمد حسین آزاد کی چھاپ پڑی ہوئی تھی۔مولانا کے فکری رجحانات براہ راست بھی اور میرا جی کے توسط سے (جو ادبی دنیا سے وابستہ تھے) حلقے کے ادیب وشاعر میں سرایت کر گئے ان کا رسالہ ''ادبی دنیا'' بھی حلقے کی آواز کو اپنے خاص لب ولہجے میں دور دور تک پھیلانے میں مدد ومعاون ثابت ہوا۔الغرض یہ دونوں قد آور شخصیتیں جو اپنے اپنے طور پر مشرقی ومغربی علوم سے آشنا تھیں،حلقہ ارباب ذوق کا فکری محور بن گئیں۔

یہ تحریک آہستہ آہستہ اپنا اثر قائم کرتی چلی گئی اور ادبا وشعرا اس کے پلیٹ فارم پر آ آ کر جمع ہونے لگے۔ان سبھوں میں ایسے تخلیقی ذہن کی کارفرمائی تھی جو اس وقت کے مذاق سخن کے لیے نامانوس اور اجنبی تھا طرز احساس،اسلوب فکر،رنگ وآہنگ،ہیئت و تکنیک،ہر اعتبار سے حلقے کا ادب اس زمانے کے قارئین اور ناقدین کے لیے زبردست چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حلقے کے وابستگان پر الزامات کی بوچھاڑ ہوئی اور انھیں جنس زدہ،مریض فراری،شکست خوردہ ذہنیت کا مالک انفرادیت پرست،

ابہام پرست، ہیئت پرست اور غیر سماجی کے القاب سے نوازا گیا۔ ان کے ادب کو فحاشی اور عریانی کا نمونہ قرار دیا گیا۔

ان تمام مخالفتوں کے باوجود یہ تحریک پروان چڑھتی رہی۔ اس کا مطمح نظر ہمیشہ یہی رہا کہ ادب قائم بالذات ہے، زندگی سے اس کا رشتہ استوار ہے یہ جمالیاتی اقدار کو بروئے کار لاتا ہے، رنگ حیات کو من وعن اجاگر کرنا ہی اس کا فرض اولین ہے لیکن یہ کسی مخصوص نظریے، کسی سیاسی عوامل اور کسی مقصد ومنشا کے لیے تبلیغی فریضہ انجام نہیں دیتا۔ چونکہ اس کی آواز پر بنائے صداقت تھی، اس لیے دور دور تک پھیلی اور لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کو حلقہ بگوش کرتی رہی۔

یہ تحریک مختلف ادوار سے گزری، میراجی اپنی وفات تک اس کو رنگ ورعنائی عطا کرنے، اس کی جڑیں مضبوط کرنے اور اپنے وسیع مطالعے وتجربے سے اسے زور آور بنانے میں منہمک رہے۔ ان کی رحلت کے بعد حلقہ ایک اہم ستون سے محروم ہوگیا۔ اگر چہ یہ تحریک آگے بڑھتی رہی لیکن آپس کے خیالات کے تضاد نے اسے کمزور کر دیا بعد ازاں 'حلقہ ارباب ذوق میں حلقہ بندی بھی ہوگئی اور دو مختلف نظریات کا حامل گروہ عالم وجود میں آیا۔ ایک کا نقطہ نظر سراسر ادبی رہا، جبکہ دوسرے نے سیاسی عوامل کو فکر وفن پر مسلط کرنا ضروری سمجھا۔

چونکہ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کسی وقتی سیاسی ہنگامے، نعرہ بازی اور سیاسی عوامل کا مظہر نہیں تھی، لہذا شدید مخالفت کے باجود یہ اب تک زندہ ہے۔ ۱۹۳۹ء میں اس نے ادبی صداقت وواقعیت کو پیش کرنے، داخلیت کو اجاگر کرنے اور جذبہ خیال اور احساس کو اہمیت دینے کا جو جامع منشور بنایا تھا اس پر ہنوز قائم ہے اس طرح اس نے اردو ادب کے ارتقا کی رفتار کو تیز تر کرنے کی جو مہم رواں صدی کی تیسری دھائی میں چلائی تھی، وہ تا حال کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

اس تحریک کے بدولت اردو شاعری عہد آفرین تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ یوں تو نظم نگاری میں تبدیلی حالی و آزاد کے زمانے سے ہی شروع ہوگئی تھی اور اقبال سے ہوتے ہوئے اختر شیرانی تک پہنچی تھی مگر نہایت آہستہ روی کے ساتھ ساتھ ہی ان شعراء کے یہاں روایت سے وابستگی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی۔ ہیئت واسلوب سے انحراف کسی ایسے مواد سے مشروط نہ تھا جو نئی ذہنی ضرورتوں کی لازمی طور پر پیداوار ہوا اور اس کا تعلق کسی سیاسی، سماجی یا تہذیبی انقلاب سے ہو۔ اردو میں جو نظم نگاری اس وقت تک رائج تھی، اس میں اکہرا پن تھا۔ نظم کے عنوان سے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ موضوع کیا ہے یوں نظم ایک سیدھی سادی منطق کے سہارے چلتی تھی جس کا آغاز وانجام دونوں پڑھنے والوں پر آئینہ کی طرح عیاں ہوجاتے تھے۔ جذبات واحساسات اور افکار وتصورات میں کسی نوع کی پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔ شاعر کی بلندی وپستی کا اندازہ یا تو اس کے احساسات وتجربات کی پستی وبلندی سے لگایا جاسکتا تھا یا اظہار کے مروجہ سانچوں پر حاکمانہ قدرت سے یا پھر موضوعات، مسائل کی پہنائی اور وسعت سے۔

حلقہ ارباب ذوق کے تحت اردو شاعری میں تبدیلی کا یہ عمل اس طرح اچانک ظہور پذیر ہوا کہ اس نے ہنگامے کی صورت

اختیار کرلی ۔اس تحریک کے شاعروں نے مغرب کے جدید شعرا سے متاثر ہوکر نظم نگاری کے فن کو نئے طریقوں سے پرکھنے کی کوشش کی ۔ پابند نظم کے بجائے ایسی
آزاد نظم جس میں چھوٹے بڑے مصرعے ہوں اور ارکان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہے یقیناً ایک جدید یت تھی ۔پھر نظم کی تعمیر کا ایک نیا طرز اور ارتقائے خیال کی ایک نئی منطق تھی جو سادہ اور بیانیہ نظم سے خاصی مختلف تھی ۔علاوہ ازیں،اس تحریک کے شعرا ذاتی تجربے کو بیان کرنے کے زیادہ قائل تھے ۔اِن کی توجہ اظہار کے فنی پہلوؤں پر زیادہ پڑتی تھی ،حقائق اور مواد پر کم ۔اس طرح حلقہ ارباب ذوق کی شاعری ہیئت کے تجربوں،ذاتی علامتوں اور ابہام وغیرہ کے لیے زیادہ مشہور ہوئی ۔

حلقے کی بنیاد ''بزم داستان گویاں'' پر استوار ہوئی تھی اور ابتدائی دنوں میں افسانے ہی پیش کیے جاتے تھے جس پر فنی حیثیت سے تنقید کی جاتی تھی ۔اگر چہ میراجی کے آنے کے بعد صنف سخن نے حلقے پر زیادہ رنگ جمالیا لیکن صنف افسانہ بھی یہاں مقبول نظر رہی اور نئے رنگ وآہنگ سے دوچار ہوتی رہی ۔اس تحریک کے افسانہ نگار اپنے کرداروں کے خارجی حالات کا اظہار نہیں کرتے ، بلکہ ان کی داخلی کیفیات کو پیش کرتے ہیں ۔وہ ان کے دلوں میں اتر کر جذبہ نہاں کو ٹٹولتے ہیں وہ افراد کے حرکات وسکنات اور چہروں پر پیدا شدہ مختلف آثار کی تصویریں کھینچتے ہیں متنوع ذہنی کیفیات ، دبی ہوئی خواہشات اور لاشعوری جذبات واحساسات کی ترجمانی ان افسانہ نگاروں کا خاص موضوع ہیں اس قسم کے بیان میں جنسی پہلو سب سے زیادہ نمایاں رہتا ہے یہ لوگ عموماً زندگی کے اقتصادی اور معاشی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی بجائے نفسیاتی تجزیے پر زیادہ زور دیتے ہیں انھوں نے داخلیت کی رو کی نمائندگی کی ہے حلقے کے افسانوی ادب میں تجرید ،تجسیم اور علامت نگاری کے کامیاب تجربے بھی کیے گئے ہیں جدید یت کی جو لہر شاعری میں رچی بسی تھی وہ افسانہ نگاری میں بھی در آئی ۔اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حلقے کے افسانہ نگاروں نے خانہ دل میں مخفی جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لیے اپنے فن میں نت نئے اسالیب اور علامت اختیار کی ہے اور داخلیت پسندی کے رجحان کو شعرا ہی کی طرح فروغ دیا ہے ۔

جہاں تک حلقہ ارباب ذوق کی تنقید کا تعلق ہے، یہ بات ذہن نشین رہے کہ جب اس کی بنیاد قائم ہوئی تھی اس وقت ترقی پسند نقاد کسی فن پارے کی تنقید کے دوران مقصد یت اور افادیت کو اہمیت دیتے تھے اور اس طرح ادب کے فنی اور جمالیاتی عوامل کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے ۔اس کے برعکس حلقے نے ادب میں حسن کی دائمی قدروں کو واضح کرنے کی کوشش کی اور تنقید کا یہی زاویہ نظر اس تحریک کا نمایاں نشان بن گیا ۔

اگر چہ حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی دور میں تاثراتی نوع کی تنقید مروج تھی اور فن پارے کے حسن و قبح کو جانچنے کے لیے وجدان کو کسوٹی سمجھا جاتا تھا لیکن میرا جی نے اپنی آمد کے بعد تنقیدی جہت کو متعین کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے تنقید نگاری میں جمالیاتی زاویہ پیدا کیا اور ادب و زندگی کے رشتے کو نقد و نظر کی بنیاد قرار دیا۔ بعد کے نقادان تحریک نے تنقید نگاری میں نیا تہذیبی رجحان پیدا کیا انھوں نے علامتوں اور استعاروں کے نئے معنی دریافت کرنے کو نقد و نظر کا لازمہ ٹھہرایا۔

المختصر، حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کا یہ فیضان ہے کہ ادب کو نئے قالبوں میں ڈھالا گیا فکر کے نئے پیمانے بنائے گئے۔ سوچنے کے نئے انداز وجود میں آئے۔ اظہار خیال کے لیے نئے نئے اسالیب وضع کیے گئے فن کار کو اپنی ذات اور واردات کا شعور حاصل کرنے میں نفسیات کے انکشافات کی مدد حاصل ہوئی۔ ابلاغ کے لیے علوم و فنون کا سہارا ڈھونڈا گیا اور اظہار ذات کے لیے علامتوں کو اپنایا گیا۔ شعر کی ساخت اور ہیئت میں ہر قسم کے تجربات کو آزمایا گیا نفسیاتی الجھنوں کی گرہ کشائی کی گئی تہ در تہ جذبات دروں کی عکاسی عمل میں آئی۔ کلاسیکی روایت کی فنی باریکیوں کے ساتھ ساتھ تمام جدید رجحانات پر بحث کا سلسلہ قائم ہوا۔ اس طرح اردو زبان و ادب کا دامن متنوع مشاہدات و تجربات افکار و خیالات اور مباحث و نظریات سے مالا مال ہو گیا۔

## ۲۔ کتابیات

نوٹ : آپ مندرجہ ذیل کتب و رسائل کی مدد سے حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کا مطالعہ فرمائیں گے:

### (الف) لازمی:


۱۔ ڈاکٹر انور سدید:

''اردو ادب کی تحریکیں'' انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۵ء

۲۔ رشید امجد، فاروق علی (مرتبین)

''پاکستانی ادب'' (پانچویں جلد) فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی، ۱۹۸۲ء

۳۔ محمد حسن عسکری: (مرتب)
''میری بہترین نظمیں'' کتابستان، الہ آباد، ۱۹۴۲ء

۴۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی
''تنقیدی زاویے'' مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء

۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا
''تنقید اور احتساب'' جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۶۸ء

۶۔ محمد طاہر فاروقی، خاطر غزنوی (مرتبین)
''خیابان'' (خاص نمبر) شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور، ۱۹۶۴ء

۷۔ میراجی
''مشرق و مغرب کے نغمے'' اکادمی پنجاب، لاہور، ۱۹۵۸ء

۸۔ یونس جاوید
''حلقہ ارباب ذوق'' لاہور

## (ب) امدادی:

۱۔ سردار جعفری
''ترقی پسند ادب'' ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

۲۔ پروفیسر جمیل احمد انجم
''اردو ادب'' علمی کتب خانہ، لاہور

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۸۶ء

۴۔ فضل قدیر (ایڈیٹر)

''ماہ نو'' کراچی، مئی ۱۹۷۲ء

۵۔ محمد طفیل (ایڈیٹر)

''نقوش'' (شخصیات نمبر) حصہ اول، لاہور

۶۔ شاہد احمد دہلوی (ایڈیٹر)

''ساقی'' دہلی، فروری ۱۹۴۴ء

۷۔ میرزا ادیب (ایڈیٹر)

''ادب لطیف'' اردو نمبر لاہور، دسمبر ۱۹۵۵ء

۸۔ ایضاً

ایضاً، اپریل ۱۹۵۴ء

## ۳۔ تفصیلی مطالعہ

نوٹ: حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کے لیے درج ذیل کتب و سائل کے متعلقہ حصے کا تفصیلی مطالعہ کیجئے۔

### (ا) تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں، صفحات ۵۵۴ تا ۵۵۵

ب۔ ادب لطیف (اپریل) صفحات ۲۴ تا ۲۵

ج۔ اردو ادب، صفحات ۱۴۰ تا ۱۴۳

د۔ پاکستانی ادب،صفحات ۳۸۴ تا ۳۸۵

ر۔ اردوادب کی مختصرترین تاریخ، صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۴

س۔ حلقہ ارباب ذوق،متعلقہ صفحات

## (۲) تحریک کے مختلف ادوار اوران کی ادبی پیشکش:

الف۔ اردوادب کی تحریکیں،صفحات ۵۶۳ تا ۵۸۰

ب۔ پاکستانی ادب،صفحات ۳۸۵ تا۳۹۰

ج۔ اردو ادب کی مختصرترین تاریخ،صفحہ ۲۳۴

د۔ ماہ نو،صفحات ۱۲ تا ۱۹

ر۔ حلقہ ارباب ذوق،متعلقہ صفحات

## (۳) حلقے پر مولانا صلاح الدین اور میراجی کے اثرات:

الف۔ اردوادب کی تحریکیں،صفحات ۵۵۹تا۵۶۳ ۵۸۸ تا۵۹۰،۶۰۰

ب۔ تنقیداوراحتساب ،صفحات ۱۳۰تا۱۳۱

ج۔ پاکستانی ادب،صفحہ۳۹۲

د۔ مشرق ومغرب کے نغمے،صفحات۱۳،۱۶۴تا ۱۶۷

ر۔ نقوش،صفحات ۵۹۰ تا ۵۹۱

س۔ ماہ نو،صفحات ۱۸ تا ۱۹

## (۴) تحریک اورادب برائے ادب:

الف۔ ترقی پسندادب،صفحہ۱۶۷

ب۔ بہترین نظمیں،صفحات ۱۷ تا۲۵

ج۔ اردوادب ، صفحہ ۸۰

د۔ اردوادب کی تحریکیں،صفحات ۵۲۴ تا ۵۶۸

ر۔ پاکستانی ادب،صفحہ ۳۸۷

س۔ خیابان ، صفحات ۲۲۲ (آخری پیراگراف)تا ۲۲۳

## (۵) حلقہ ارباب ذوق کی شاعری:

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں،صفحات ۵۸۵ تا ۵۹۸

ب۔ اردو ادب ،صفحات ۸۰ تا ۸۱

ج۔ تنقیدی زاویے،صفحات ۳۲۸ (آخری پیراگراف تا ۳۳۰)

د۔ تنقید اور احتساب،صفحات ۱۲۸ تا ۱۳۱

ر۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

صفحات ۳۲۹ تا ۳۳۰ ___ ۳۴۲ تا ۳۴۴

س۔ ساقی (فروری) صفحات ۳۱ تا ۳۶

ص۔ خیابان، صفحات ۲۰۰ تا ۲۰۱ _____ ۲۹۵ تا ۲۹۹

## (۶) حلقہ ارباب ذوق کا افسانہ:

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں،صفحات ۵۹۹ تا ۶۰۶

ب۔ تنقیدی زاویے،صفحات ۲۸۵ تا ۲۸۷

ج۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،صفحات ۳۵۳ تا ۳۰۶

د۔ خیابان،صفحات ۲۰۶ تا ۲۰۷، ۳۴۴

## (۷) حلقہ ارباب ذوق کی تنقید:

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں،صفحات ۶۰۷ تا ۶۱۶

ب۔ پاکستانی ادب،صفحہ ۳۸۸

ج۔ اردو ادب ،صفحہ ۲۹۸

د۔ ادب لطیف (اردو نمبر) ،صفحات ۵۴ تا ۵۶

ر۔ ادب لطیف (اپریل) ،صفحات ۲۷ تا ۲۸

س۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، صفحہ ۲۳۳

## (۸) اردو ادب پر تحریک کے اثرات:

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں ، صفحات ۶۱۶ تا ۶۱۷

ب۔ خیابان، صفحات ۲۰۰ تا ۲۰۱

ج۔ ادب لطیف (اپریل) ، صفحہ ۲۷

## ۵۔ خود آزمائی

۱۔ حلقہ ارباب ذوق کے وجود میں آنے کے کیا اسباب و عوامل تھے؟ تفصیلی بحث کیجئے۔

۲۔ یہ تحریک جن مختلف ادوار سے گزری ہے اُن کا جائزہ لیجئے۔

۳۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق فرمائیں گے کہ مولانا صلاح الدین احمد اور میرا جی نے اس تحریک کا خاکہ وضع کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے؟ جواب مدلل دیجئے۔

۴۔ یہ تحریک ادب برائے ادب کی ترجمان تھی، اس کلیے پر بحث کیجئے۔

۵۔ اس تحریک کی بدولت اردو شاعری عہد آفریں تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ تجزیہ کیجئے۔

۶۔ تحریک سے وابستہ شاعروں اور ان کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

۷۔ حلقے کے افسانوی ادب کا محاکمہ کیجئے۔

۸۔ حلقہ ارباب ذوق کی بدولت کس قسم کی تنقید وجود میں آئی؟ سیر حاصل بحث کیجئے۔

۹۔ ترقی پسند تحریک کے برعکس حلقہ ارباب ذوق کی تحریک ہنوز قائم ہے۔ وجوہات پر روشنی ڈالیے۔

۱۰۔ اس تحریک کی بدولت اردو زبان و ادب پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے، ان کا تعین کیجئے۔

یونٹ ۹ ۔ ۱۰

# پاکستانی ادب / اسلامی ادب کی تحریک

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمٰن

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| ۱۔ | یونٹ کے مقاصد | 71 |
| ۲۔ | موضوع کا تعارف | 72 |
| ۳۔ | کتابیات | 78 |
| ۴۔ | تفصیلی مطالعہ | 81 |
| ۵۔ | خودآزمائی | 84 |

# یونٹ کے مقاصد

پاکستانی ادب / اسلامی ادب کی تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے دوران اس یونٹ کے درج ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھئے تا کہ آپ:

۱۔ قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد سے باخبر ہو سکیں۔

۲۔ پاکستانی ادب / اسلامی ادب کے محرک عوامل کا پتہ چلا سکیں۔

۳۔ تحریک کو فروغ دینے میں محمد حسن عسکری کی تحریری کدوکاوش کا سراغ لگا سکیں۔

۴۔ تحریک کی تشکیل و ترقی کے سلسلے میں "حلقہ ادب اسلامی" کے کارناموں کا جائزہ لے سکیں۔

۵۔ ادب کے پاکستانی و غیر پاکستانی اور اسلامی و غیر اسلامی ہونے کی بحث کا تجزیہ کر سکیں۔

۶۔ تحریک کو نشو و نما دینے کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔

۷۔ تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے ناولوں کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کر سکیں

۸۔ تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں اور ان کے فن کا محاکمہ کر سکیں۔

۹۔ تحریک ادب اسلامی کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈال سکیں۔

۱۰۔ اس ادبی تحریک کی تنقید نگاری کا تجزیہ کر سکیں۔

۱۱۔ اردو ادب پر اس تحریک کے اثرات کا تعین کر سکیں۔

## ۱۔ موضوع کا تعارف

اردو میں پاکستانی ادب / اسلامی ادب کی تحریک کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پہلے درج ذیل تعارف بغور پڑھیں:

علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ایک اسلامی ریاست کا جو سنہرا خواب دیکھا تھا، اسے حقیقت کے رنگین سانچے میں ڈھالنے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح پیکر عزم و عمل بن کر آگے بڑھے۔ ان کے مدمقابل کانگرس جماعت تھی جو پورے برعظیم کے سوراج کی واحد طلب گار تھی لیکن قائداعظم مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے دس کروڑ مسلمانوں کی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے واحد قومی نظریے کا ابطال کرتے ہوئے دو قومی نظریے کا برملا اعلان کر دیا تھا۔

قائداعظم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے کہ کانگریس جماعت اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے اسلامی تہذیب و تمدن

'معاشرت و معیشت اور اقدار و روایات کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے ۔ وہ جان چکے تھے کہ یہ فرقہ پرست جماعت ہندی کے روپ میں سنسکرت کو رائج کر کے اور واردھا اسکیم کے نام سے نئے تعلیمی منصوبے جاری کر کے اسلامیان ہند کو اکھنڈ بھارت کا غلام بنانے کے در پے ہے ۔ وہ ہر حالت میں مسلمانوں کو اقلیت قرار دے کر ان کے تشخص کو مسخ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔

یہ تھے وہ نامساعد حالات جن میں قائداعظم اور دیگر مسلم رہنماؤں نے سر جوڑ کر سوچنا شروع کیا کہ فرقہ پرست اور متعصب کانگریس کے سیاسی ہتھکنڈوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے اور مسلمانان برعظیم کے لیے سکون و طمانیت کے ساتھ اسلامی ماحول و معاشرے میں زندگی بسر کرنے کا کونسا طریقہ اختیار کیا جائے ۔

انہی تلخ حالات اور ان سے اخذ شدہ تجربات کا نتیجہ تھا کہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال کے اسلامی ریاست کی تشکیل کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے "قرارداد پاکستان" پیش کی گئی ۔ مسلم زعما کے اس یادگار اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ :

"چونکہ ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو، تہذیب و تمدن سب خطرے میں ہیں اور اب کوئی صورت ایسی باقی نہیں ہے کہ دونوں قومیں مل کر اس ملک پر حکومت کر سکیں، اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ برعظیم کے وہ حصے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، باقی ہندوستان سے الگ کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنی خواہشات اور قومی امنگوں کے مطابق آبرومندانہ زندگی گزاریں اور اپنے تہذیب و تمدن کو پروان چڑھائیں"۔

اس اعلان سے اسلامیان ہند کی منزل مقصود متشکل ہو گئی اب وہ ایک ایسے ملک کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئے جہاں قرآن و سنت کے احکام کی بالادستی ہو گی، جہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے بہت سے مواقع میسر ہوں گے اور جہاں مسلم معاشرے کا عکس نمایاں ہو گا ۔

برعظیم کے مسلمانوں کی مسلسل جدوجہد اور بے پایاں ایثار کی بدولت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو "پاکستان" کے نام سے ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا ۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ یہ ملک اسلام کے لیے بنا تھا اور اسلام کے نام پر بنا تھا ۔ "اسلام" ہی کے مقدس نعرے کو لے کر مسلم لیگ آگے بڑھی تھی اور اسلامیان ہند نے اسلامی جذبے کے تحت ہی حصول پاکستان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی ۔

اسلام جب پاکستان کے وجود کا مقصد عظیم قرار پایا تو یہ ظاہری بات ہے کہ اس ملک کا ادب بھی اسی مقصد وجود کا آئینہ دار ہو گا ۔ مختصر لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ادب دراصل پاکستانی ادب ہے، اور پاکستانی ادب وہی ہو سکتا ہے جس میں اسلامی افکار و اقدار جلوہ گر ہوں ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی ادب /اسلامی ادب کی تحریک قیام پاکستان کے بعد وجود میں آئی ۔اس کے نمو پذیر ہونے کی نمایاں وجہ تو تشکیل پاکستان کے وہ مقاصد تھے جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ۔دوسری وجہ ترقی پسند تحریک کا انقلابی نعرہ تھا۔آپ نے یونٹ نمبر ۵ ۔۶ میں اس امر کا مطالعہ کیا ہوگا کہ یہ تحریک برعظیم میں آزادی کی طلب گار اس حد تک تھی کہ برطانوی استبداد سے چھٹکارا حاصل ہو،لیکن یہ سرخ جماعت ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کی حامی نہ تھی ۔چنانچہ قیام پاکستان کے بعد اس نے کھلم کھلا اشتراکیت کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا ۔ظاہری بات ہے اس نعرۂ لینن کا مطلب لادینیت اور الحاد تھا اور اس کی براہ راست ضرب پاکستان کی بقا اور سالمیت پر پڑ رہی تھی جو اسلامی نظریات کا منبع و محور تھا۔لہذا یہ ضروری سمجھا گیا کہ شعر و ادب کے لیے اشتراکی تصورات کی بیخ کنی کی جائے اور فکر و فن کو اسلامی اقدار و روایات کے سانچے میں ڈھالا جائے تا کہ تعلیمات اسلامی عام ہوں اور نوزائیدہ ملک کے عوام کی ذہنی اور اخلاقی تربیت صالح ادب کے ذریعے کی جا سکے ۔

اس تحریک کو فروغ دینے میں سب سے اہم کردار محمد حسن عسکری نے ادا کیا تھا۔پاکستان کے قیام کے بعد جب ''ساقی'' دہلی سے کراچی منتقل ہوا تو انھوں نے اپنے مشہور زمانہ کالم ''جھلکیاں'' میں متعدد مضامین لکھ کر اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ۔انھوں نے اسلامی تہذیب کی اقدار پر اس اعتماد کو بحال کرنے کی سعی بلیغ کی جس سے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیم یافتہ طبقہ تقریباً محروم ہو گیا تھا۔عسکری کے خیال میں اس اعتماد کی بدولت ہی ادبی تخلیقات میں اسلامی اقدار و روایات کی ترجمانی ممکن تھی ۔مزید برآں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''پاکستان یا اسلامی ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ریاکاری کو مطلق دخل نہ ہو۔اگر آپ اسلام کے کسی اصول پر ایمان نہ لا سکے تو اپنے افسانے یا نظم میں اپنا پورا ذہنی اور روحانی تجربہ پیش کیجئے کہ فلاں فلاں نفسیاتی محرکات مجھے ایمان نہیں لانے دیتے''۔

حسن عسکری کی ذاتی کوششوں کے علاوہ،اسلامی اقدار و روایات پر اعتماد کلی رکھنے والے ادبا و شعرا نے ۱۹۴۸ء میں حلقہ ادب اسلامی پاکستان کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی ۔اس کے خد و خال متعین کرنے اور لکھنے والوں میں قومی شعور اور ملی رجحان کو فروغ دینے کے لیے باقاعدہ منشور تیار کیا گیا ۔اس کے تحت اسلامی روح کو ادب میں سمو کر پیش کرنے ،الحاد و عریانیت کے عناصر کو ختم کرنے، اخلاقی اساس کو ادب کی بنیاد قرار دینے اور اسلامی نظریات کے منافی عوامل کی بیخ کنی کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے ۔

اس تحریک کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں خدمات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انجام دی ہیں ۔انھوں نے اسلامی فکر و نظر کی اشاعت کے دوش بدوش ادب کے ظاہری حسن و اقدار کی اہمیت بھی واضح کی ۔ان کے علاوہ جن لکھنے والوں نے اس تحریک کو تاب و توانائی عطا کی' ان میں نعیم صدیقی،نسیم حجازی،اسعد گیلانی،فروغ احمد،خورشید احمد، ہارون الرشید،ماہر القادری' عبدالکریم ثمر، آثم میرزا،محمود فاروقی اور ابوالخطیب کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔

پاکستان یا اسلامی ادب پر اعتراضات کی بوچھاڑ بھی ہوئی اور بحث ومباحثہ کا سلسلہ دراز اس کا قدرتی نتیجہ تھا۔کہا یہ گیا کہ کیا ادب بھی اسلامی یا غیر اسلامی کے خانوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔کیا اخلاقی پابندیوں کی وجہ سے ایسا ادب سراسر خشک' بے جان اور غیر دلکش نہیں ہوگا۔مذہب واخلاق سے ادب کا جوڑ انمل ہوگا اگر ادب میں مذہبات کا تذکرہ ہوا تو وہ ادب نہیں رہے گا' پروپیگنڈا بن جائے گا۔جواب میں پاکستان یا اسلامی ادب کے حامیوں نے یہ وضاحت کی کہ یہ مفروضات قابل توجہ نہیں۔جو بھی فنکار زندگی اور اس کے کوائف سے تعرض کرے گا' اسے یقیناً اخلاقیات سے بھی دوچار ہونا پڑے گا جلیل القدر ادبی تخلیقات ہمیشہ کسی بلند اخلاقی نصب العین کی رہنمائی کرتی ہیں۔عظیم المرتبت ادب اس وقت تک تخلیق نہیں ہوسکتا جب تک ادیب فی الواقع اخلاقی اقدار پر ایمان نہ لائے۔مزید برآں' یہ جواب بھی دیا گیا کہ مملکت پاکستان کے حصول کے پس منظر میں کون سے عناصر کارفرما تھے۔وطن عزیز کی اساس بننے والی کون سی آئیڈیولوجی تھی۔وہ کون سی اقدار ہیں جن کے پروان چڑھانے کی خاطر ہزاروں لاکھوں افراد کی قربانی دی گئی۔وہ کونسا نظام حیات ہے جو انسانیت کی معراج بن سکتا ہے۔ظاہر ہے ان باتوں کا شافی جواب اسلامی اقدار وروایات کے فروغ میں ہی پنہاں ہے۔

اب آیئے! اس ادبی تحریک کے تحت جو تخلیقات منظر عام پر آئیں،ان کا جائزہ لے لیا جائے۔سب سے پہلے ناول کو لیجیے۔مسلم تاریخ کے اہم واقعات کو موضوع بنایا گیا۔اسلامی ناول بھی لکھے گئے۔ان دونوں اقسام کے ناولوں کا محرک یہ جذبہ تھا کہ اسلامی بنیادوں پر ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے ذہنی فضا تیار کی جائے۔قیام پاکستان کے فوراً بعد کا ماحول اس قسم کے ناولوں کے لیے نہایت سازگار تھا۔ایسے ناول نگاروں میں نسیم حجازی،قیسی رامپوری،ایم اسلم اور رئیس احمد جعفری خاصے نمایاں ہیں۔فنی لحاظ سے قابل گرفت ہونے کے باوجود ان ناولوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ناول کی صنف ازسرنو زندہ ہوئی اور آئندہ کی فنی ترقی کے لیے راہ ہموار ہوئی۔بے مقصد رومانیت سے ہٹ کر اجتماعی یا خالص قومی مقاصد کو پیش کرنے کی مثبت کوشش عمل میں آئی۔بعد کے زمانے میں ابوالخطیب،وحیدہ نسیم،عفت قریشی،فاطمہ شہناز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تحریک کے افسانہ نگاروں نے اصلاح پسندی کے جذبے اور مقصدیت کے اصول کو اپنا رہنما بنایا ہے۔اسلامی اقدار و روایات اور نظریہ پاکستان کی تشہیر ان افسانوں کا محور بنا ہے اسلامی ذہن رکھنے والے یہ ادیب جدید ترین شعور سے آشنا ہیں' اسی لیے ان کے ہاں حقیقت وواقعیت اور مقصد ومنشا کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں نعیم صدیقی' اسعد گیلانی' محمود فاروقی،آثم میرزا اور ابوالخطیب قابل ذکر ہیں۔بعد کے دور میں اس تحریک کے رنگ ورخ کو جن افسانہ نگاروں نے فنکارانہ طور پر پیش کیا' ہے ان میں پرانے ادیب آثم میرزا،ابوالخطیب اور اسعد گیلانی بھی ہیں اور نئے لکھنے والے سید نظر زیدی،الطاف فاطمہ،ام زبیر، بنت الاسلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔

تحریک ادب اسلامی ایک صالح معاشرے کے قیام کی خواہاں رہی ہے' لہذا اس کی شاعری میں مقصدیت کا اظہار اور خطابت کی گھمبیر نمایاں ہے۔اشعار میں اوالعزمی کے تیور اور عالی حوصلگی کے جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔ابتدائی زمانے میں اسد ملتانی، ماہر القادری،عبدالکریم ثمر،نعیم صدیقی وغیرہ اس حلقے کے صف اول کے شعرا رہے ہیں۔آنے والے دور میں عبدالعزیز خالد نے تحریک کے نصب العین کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس تحریک کا نمایاں اثر عام اردو شاعری پر یہ ہوا کہ نعت گوئی کی جانب خصوصیت سے توجہ دی جانے لگی ہے۔صرف تحریک کے شاعروں، ماہر القادری،نعیم صدیقی ،عبدالعزیز خالد وغیرہ نے ہی اعلیٰ پائے کی نعتیں نہیں کہی ہیں بلکہ اس حلقے سے غیر وابستہ شعرا نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کو موضوع سخن بنا کر عوام کی اخلاقی تربیت کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔علاوہ ازیں اسلامی ترانے کی تخلیق بھی دراصل اسلامی ادب ہی کی رہین منت ہے۔

اس تحریک کی تنقید نگاری پر بھی مقصدیت کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔نقادوں نے پاکستانی/اسلامی ادب کی توضیح کرنے پر زور قلم صرف کیا ہے جس کے نتیجے میں خالص نظری تنقید نے جنم لیا ہے۔مزید برآں اس تحریک پر کیے گئے اعتراضات کا مثبت جواب بھی نقد ونظر کے حوالے سے ہی دیا گیا ہے اور اس طرح مناظرے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔پروفیسر فروغ احمد،نعیم صدیقی ،نجم الاسلام، پروفیسر ہارون الرشید وغیرہ نے اپنی نظری تنقید اور فکری استدلال سے تحریک کے مقاصد کو روشناس کرانے اور ادبی تنقید نگاری میں ایک نئی جہت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے

آخر میں یہ بتانا بھی مناسب ہوگا کہ اس ادبی تحریک نے قیام پاکستان کے مقصد ومنشا کو اجاگر کرنے کی ہمہ جہت کوشش کی ہے۔اس کے تحت اسلامی شعور کے احیاء کے لیے موثر اقدامات عمل میں آئے۔روحانی دنیا اور اس کے متعلقہ کوائف کا ذکر چھیڑا گیا ہے۔خدا کا تصور، انسان کا اس سے تعلق اور روحانیت کی اعلی قدریں بروئے کار لائی گئی ہیں۔مادیت کے استبداد کے سامنے انسانیت کی ارفع اقدار جس طرح ملیامیٹ ہو رہی تھیں ،انہیں از سر نو زندہ کیا گیا ہے۔اس تحریک کی بدولت معاشرے کی اکثریت گمرہی وکجروی اور صحت مند وتوانا عناصر میں تمیز کرنے کے قابل بنی ہے۔اس تحریک کے ادیبوں اور شاعروں نے حق گوئی اور بے باکی کو کام میں لاتے ہوئے ان تمام تخریبی تحریکات ورجحانات کی نفی کی ہے جو نہ صرف معاشرے کو سربلندی کی منزلوں کی طرف بڑھنے سے روکتے ہیں' بلکہ ماحول میں غیر صالح عناصر کی نشوونما بھی کرتے ہیں۔

## ۲۔ کتابیات

آپ مندرجہ ذیل کتب ورسائل کی مدد سے پاکستانی ،اسلامی ادب کا مطالعہ فرمائیں گے:

## (الف) لازمی


۱۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

''برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ'' شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۔ سید حسن ریاض

''پاکستان ناگزیر تھا'' شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی' کراچی، ۱۹۶۷ء

۳۔ ڈاکٹر انور سدید

''اردو ادب کی تحریکیں'' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ، ۱۹۸۵ء

۴۔ پاشا رحمٰن، مشفق خواجہ، آمنہ مشفق (مرتبین)

''تخلیقی ادب'' نمبر۲ عصری مطبوعات، کراچی ۱۹۸۰ء

۵۔ رشید امجد، فاروق علی (مرتبین)

''پاکستانی ادب'' (پانچویں جلد) فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی ۱۹۸۲ء

۶۔ طاہر فاروقی، خاطر غزنوی (مرتبین)

''خیابان'' (خاص نمبر) شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور ۱۹۶۴ء

۷۔ محمد حسن عسکری

''جھلکیاں'' (حصہ اول) مکتبہ الروایت، لاہور

۸۔ پروفیسر فروغ احمد

''اسلامی ادب کا جائزہ'' اسلامی ادبی اکادمی، لاہور ۱۹۶۸ء

## (ب) امدادی

۱۔ محمد حسن عسکری ''انسان اور آدمی'' مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۵۳

۲۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری

''معیار ادب'' مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۱ء

۳۔ پروفیسر ہارون الرشید ''اردو ادب اور اسلام''

اسلامک پبلیکیشنز ، لاہور ۱۹۷۰ء

۴۔ پروفیسر نظیر صدیقی

''میرے خیال میں'' مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۸ء

۵۔ ڈاکٹر محمود الرحمان

''جنگ آزادی کے اردو شعرا قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد ۱۹۸۶ء

۶۔ حنیف رامے (ایڈیٹر) ''سویرا'' لاہور، شمارہ ۱۹، ۲۰ اور ۲۱

۷۔ نعیم صدیقی (ایڈیٹر) ''سیارہ'' ، لاہور، ابوالاعلیٰ مودودی نمبر، شمارہ نمبر ۱۱

۸۔ صہبا لکھنوی (ایڈیٹر)

''افکار'' جوبلی نمبر، جون جولائی ۱۹۷۰ء رابنسن روڈ، کراچی

## ۳۔ تفصیلی مطالعہ

**نوٹ:** پاکستانی /اسلامی ادب کی تحریک کے ضمن میں آپ درج ذیل کتب و رسائل کے متعلقہ حصے کا تفصیلی مطالعہ فرمائیں گے:

۱۔ قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد

الف۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ صفحات ۳۸۲ تا ۳۸۸

ب۔ پاکستان ناگزیر تھا، صفحات ۱۷۹ تا ۱۸۰، ۴۰۴ تا ۴۰۵

ج۔ جنگ آزادی کے اردو شعرا، صفحات ۳۸۹ تا ۳۹۴

۲۔ پاکستانی /اسلامی ادب کے محرک عوامل

الف۔ اردو ادب کی تحریکیں: صفحات ۶۱۸ تا ۶۲۰

ب۔ خیابان صفحات ۱۷۷ تا ۱۷۸

ج۔ پاکستانی ادب ، صفحہ ۴۰۱

۳۔ تحریک کا فروغ اور حسن عسکری

الف۔ میرے خیال میں، صفحات ۳۲۲ تا ۳۲۳

ب۔ جھلکیاں، صفحات ۳۱۲ تا ۳۲۶

۴۔ حلقہ ادب اسلامی

الف۔ تخلیقی ادب، صفحہ ۳۱۳

ب۔ اردو ادب کی تحریکیں، صفحات ۶۱۸ تا ۶۲۰

ج۔ اسلامی ادب کا جائزہ، متعلقہ صفحات

۵۔ پاکستانی و غیر پاکستانی ادب کی بحث

الف۔ خیابان، صفحات ۱۶۸ تا ۱۷۷

ب۔ اردو ادب کی تحریکیں ، صفحہ ۶۲۲

ج۔ پاکستانی ادب،صفحات ۴۰۰ تا ۴۰۱

د۔ افکار،صفحات ۵۰۹ تا ۶۰۷

ر۔ معیارادب ، متعلقہ صفحات

۶۔ تحریک کےفروغ میں مولانا مودودی کا حصہ

الف۔ اردوادب کی تحریکیں،صفحہ۶۲۳

ب۔ تخلیقی ادب ، صفحات ۳۱۴ تا ۳۱۶

ج۔ سیارہ ، متعلقہ صفحات

۷۔ تحریک کی ناول نگاری

الف۔ سویرا،صفحات ۲۵۲ تا ۲۵۶

ب۔ تخلیقی ادب،صفحات ۳۲۴ تا ۳۲۵

ج۔ پاکستانی ادب ،صفحات ۸۱۲ تا ۸۱۳

۸۔ تحریک کی افسانہ نگاری

الف۔ اردوادب کی تحریکیں،صفحات۵۲۵ تا ۵۲۶

ب۔ تخلیقی ادب ، صفحات ۳۲۱ تا ۳۲۴

۹۔ تحریک کی شاعری

الف۔ اردوادب کی تحریکیں ، صفحات ۶۲۴ تا ۶۲۵

ب۔ تخلیقی ادب ، صفحات ۳۱۷ تا ۳۲۱

۱۰۔ تحریک کی تنقید نگاری

الف۔ اردوادب کی تحریکیں،صفحات۶۲۲ تا ۶۲۴

ب۔ تخلیقی ادب،صفحات ۳۳۲ تا ۳۳۴

۱۱۔ اردوادب پر تحریک کےاثرات

الف۔ خیابان، صفحات ۱۷۵ تا ۱۷۷ ۔۔ ۲۲۱ تا ۲۲۲

ب۔ تخلیقی ادب، صفحات۳۱۳ تا ۳۳۵

## ۴۔ خودآزمائی

۱۔ اس بارے میں دورائے نہیں ہوسکتیں کہ پاکستان اسلام کے لیے بنا تھااور اسلام کے نام پر بنا تھا۔اس کلیے پر بحث کیجئے۔

۲۔ پاکستانی /اسلامی ادب کی تحریک کے اسباب وعوامل کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

۳۔ محمد حسن عسکری نے اسلامی تہذیب کی اقدار پر اس اعتماد کو بحال کرنے کی سعی بلیغ کی جس سے انقلاب ۵۷ کے بعد تعلیم یافتہ طبقہ تقریباً محروم ہوگیا تھا۔اس خیال سے متعلق مدلل رائے دیجئے۔

۴۔ تحریک کی تشکیل وترقی کے سلسلے میں ''حلقہ ادب اسلامی'' کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

۵۔ تحریک کے فروغ میں مولانا مودودی کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

۶۔ کیا ادب کو پاکستانی وغیر پاکستانی اور اسلامی وغیر اسلامی کے خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے؟اس سوال کا مدلل جواب دیجئے۔

۷۔ تحریک کے تحت لکھے جانے والے ناولوں نے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے ذہنی فضا تیار کی۔آپ اس خیال سے کہاں تک متفق ہیں؟

۸۔ تحریک ادب اسلامی کی افسانہ نگاری پر حقیقت وواقفیت اور مقصد ومنشا کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔کیا یہ صحیح ہے؟

۹۔ تحریک کی شاعری اور اس کے دوررس اثرات پر روشنی ڈالیے۔

۱۰۔ تحریک کی تنقید عملی نہیں نظری ہے۔بحث کیجئے۔

۱۱۔ پاکستان/ اسلامی تحریک کی بدولت اردو ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں،ان کا تعین کیجئے۔

یونٹ ۱۱ ۔ ۱۲

# انیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر

تحریر: نظیر صدیقی

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کے مقاصد | 87 |
| ۱۔ | انیسویں صدی کے مغرب میں شاعری سے متعلق بحثوں کا تاریخی پس منظر | 88 |
| ۲۔ | رومانوی شاعری اور اس کے دو ممتاز نمائندوں کے نظریات شعر | 94 |
| ۳۔ | وکٹورین عہد کے عظیم نقاد میتھیو آرنلڈ کا نظریہ شعر | 98 |
| ۴۔ | علامتی شاعری اور اس کے نمائندوں کے نظریات شعر | 99 |
| ۵۔ | اردو شعر و ادب پر رومانوی شاعری اور علامتی شاعری کے اثرات | 102 |
| ۶۔ | مطالعے کے لیے مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست | 104 |
| ۷۔ | خود آزمائی | 105 |

# یونٹ کے مقاصد

عزیز طلباء وطالبات

ان دو یونٹوں کا موضوع ہے "انیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر" ان یونٹوں کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انیسویں صدی کے مغرب میں شاعری سے متعلق بحثوں کے تاریخی پس منظر سے واقف ہونا۔

۲۔ انیسویں صدی میں مغربی شاعری کی دو اہم ترین شعری تحریکات یعنی رومانوی شاعری اور علامتی شاعری سے واقفیت حاصل کرنا۔

۳۔ رومانوی شاعری اور علامتی شاعری کے ممتاز ترین نمائندوں کے نظریات شعر سے آشنا ہونا۔

۴۔ انیسویں صدی کے وکٹورین عہد کے عظیم نقاد میتھیو آرنلڈ کے نظریہ شعر سے آگاہی حاصل کرنا۔

۵۔ اردو شعر وادب پر انیسویں صدی کے مغرب کی رومانوی شاعری اور علامتی شاعری کے اثرات کا تجزیہ کرنا۔

## ۱۔ انیسویں صدی کے مغرب میں شاعری سے متعلق بحثوں کا تاریخی پس منظر

ہر زبان کے ادب میں شاعری پہلے وجود میں آئی ہے اور نثر بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے ادب میں شاعری اور اس کے متعلقات سے زیادہ بحث ہوتی رہی ہے۔ مغرب کے شعر وادب کا سرچشمہ یونان ہے۔ یونانی ادب میں بھی ایسا ہی ہوا کہ شاعری پہلے پیدا ہوئی اور نثر بعد میں۔ شاعری سے متعلق نظریاتی بحثیں بھی سب سے پہلے یونان ہی میں شروع ہوئیں۔

ان بحثوں کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ وہ آج تک مغرب کے نظریہ شعر پر کسی نہ کسی اعتبار سے اور کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہیں۔ اس لیے انیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے تاریخی اعتبار سے پیچھے جانا پڑے گا۔

مغربی شاعری سے متعلق نظریات میں ایک بات جو بہت نمایاں ہے، وہ یہ ہے کہ یونان میں شاعری کے پہلے نقاد افلاطون

سے لے کر موجودہ صدی تک شاعری کی مخالفت ہوتی رہی ہے جس کے نتیجے کے طور پر افلاطون کے شاگرد ارسطو سے لے کر عہد حاضر کے مغربی نقاد آئی اے رچرڈس اور فلسفی کروچے تک شاعری کی حمایت میں لکھنا اور شاعری کا جواز ثابت کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

افلاطون (۴۲۷۔۳۴۷ق م) خود پیدائشی شاعر تھا۔اس نے اپنے استاد کے زیر اثر اپنی نظموں اور ڈراموں کو جلا دیا اور اپنی عظیم تصنیف ''جمہوریہ'' میں شاعر کے متعلق نہایت بلند تصورات ظاہر کرنے کے باوجود اس نے شاعر کو اپنی مثالی جمہوریہ سے ملک بدر کر دیا۔

افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریہ'' میں معاشرے کے لیے جو نظام اخلاق پیش کیا ہے' اس میں شاعر اپنی ذہنی اور تخلیقی صفات کے باعث خلل انداز ہوتا ہے۔اس لحاظ سے وہ نہ خود اچھا شہری ہوتا ہے، نہ دوسروں کو اچھا شہری بننے میں مدد دیتا ہے۔وہ انسانی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے اور انسان کو بدی کی راہ پر لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شاعر پر افلاطون کا دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ حقیقت کی مصوری نہیں کر سکتا۔وہ حقیقت کی مصوری سے دو درجہ دور ہوتا ہے۔ شاعر اور شاعری پر افلاطون کے اعتراضات ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں صفحہ ۴ سے لے کر صفحہ ۸ تک دیکھئے۔

ارسطو نے (۳۸۴۔۳۲۲ق م) نے اپنے استاد افلاطون کا نام لیے بغیر شاعر اور شاعری سے متعلق اس کے خیالات کی تردید کی۔تفصیل کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کی مذکورہ بالا کتاب کو صفحہ ۸ سے ۱۶ تک دیکھئے۔

افلاطون شاعری کا مخالف تھا۔وہ اسے فلسفیانہ اعتبار سے غلط اور اخلاقی و معاشرتی نقطہ نظر سے مضر تصور کرتا تھا۔ارسطو کی رائے اس کے برعکس تھی۔اس نے شاعری کی حمایت بھی کی اور اس کا جواز بھی پیش کیا۔

افلاطون اور ارسطو قبل مسیح کے زمانے کے لوگ تھے۔مسیحیت کے آغاز کے کوئی تین سو سال بعد، تیرہ سو سال کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں عہد ظلمت کے نام سے جانا جاتا ہے۔تاریکی کے اس طویل دور میں مذہب زندگی کے ہر پہلو پر حاوی رہا اور انسانی زندگی اخلاقی جکڑبندیوں کا شکار رہی۔اس دور میں شاعری اور دین ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔اس لیے یہ خیال عام تھا کہ نہ صرف شاعری دینیات ہے بلکہ دینیات بھی شاعری ہے۔

سولہویں صدی سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی ابتداء ہوئی تو انگلستان کے شاعر سر فلپ سڈنی (۱۵۵۴۔۱۵۸۶) کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس دوران میں شاعری پر جو الزامات عائد کیے جاتے رہے ہیں انھیں رد کر کے انسانی زندگی میں شاعری کی اہمیت اور اس کا مقام واضح کیا جائے اس کی اس خواہش اور کوشش کا نتیجہ اس کا مقالہ ''شاعری کا جواز'' ہے جو یورپ کا ایک تنقیدی شاہکار ہے۔

---

سر فلپ سڈنی کا مقالہ اور سڈنی کے بارے میں آپ ڈاکٹر جمیل جالبی کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۳۱ سے ۳۳ اور ۲۳۸ سے ۲۵۹ تک پڑھیں۔

۱۸۲۰ء کے قریب انگریز ادیب ٹامس لو پیکوک (Thomas Love Peacock) (۱۷۸۵۔۱۸۶۶) نے شاعری کی مخالفت میں ایک مقالہ لکھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اب دنیا کو شاعری کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ پیکوک کی تردید میں انیسویں صدی کے مشہور انگریز شاعر شیلے (۱۷۹۲۔۱۸۲۲) نے اپنا عہد آفریں مضمون ''شاعری کا جواز'' لکھا جس میں اس نے نہایت پرزور طریقے سے شاعری کی ضرورت اور افادیت ثابت کی۔(۱)

شاعری پر پیکوک کا ایک اعتراض یہ تھا کہ ایک سائنسی دور میں شاعری ایک قسم کی بربریت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔اس کے جواب میں شیلے نے جو لکھا سو لکھا، شاعری کی ضرورت اور افادیت ثابت کرنے کے لیے انیسویں صدی کے ایک عظیم انگریز نقاد میتھیو آرنلڈ نے یہ دعویٰ کیا کہ ''شاعری کے بغیر ہماری سائنس نامکمل دکھائی دے گی اور شاعری بہت سی ایسی چیزوں کی جگہیں لے گی جنہیں ہم اب مذہب اور فلسفے کے نام سے پکارتے ہیں۔(۲)

مغرب میں شاعری کی مخالفت اور حمایت سے صرف یہ بات سامنے نہیں آتی کہ اگر ایک طرف شاعری کو حقارت سے دیکھا گیا تو دوسری طرف اس کی فضیلت پر اصرار کیا گیا۔شاعری کی فضیلت کو اجاگر کرنے کے لیے جو باتیں کہی گئیں وہ شاعری سے متعلق کئی تصورات ونظریات کو جنم دے گئیں۔

شاعری کے سب سے پہلے مخالف افلاطون کو بھی اس کا اعتراف تھا کہ شاعری شاعر کی الہامی قوت سے وجود میں آتی ہے اور یہ کہ شاعری بھی ''حقیقت'' کی نقل ہے۔یہ اور بات ہے کہ شاعری ''حقیقت'' سے دو درجہ دور ہوتی ہے۔

افلاطون کے جواب میں شاعری کی حمایت کرتے ہوئے ارسطو افلاطون کے نقل (Memesis) والے نظریے کو آگے لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان میں نقل کرنے کی جبلت ازل سے موجود ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے اندر نقل کے ذریعے وجود میں آئے ہوئے کاموں سے لطف اندوز ہونے کی جبلت بھی ہے لیکن شاعری زندگی کی بے معنی نقل نہیں ہے۔شاعر صرف نقل نہیں کرتا بلکہ نقل کے ذریعے اس عالم مثال تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جو افلاطون جیسے فلسفی کا مطمح نظر ہے۔

افلاطون نے کہا تھا کہ شاعر جھوٹا اور بدکار ہوتا ہے اس کے جواب میں ارسطو نے کہا تھا کہ فن شاعری پر صحت کا وہ نظریہ عائد کرنا جو زندگی کے دوسرے امور پر عائد کیا جاتا ہے، غلط ہے۔شاعری آفاقی صداقتوں سے سروکار رکھتی ہے جبکہ تاریخ مخصوص صداقتوں سے سروکار رکھتی ہے۔اس لیے شاعری تاریخ کے مقابلے میں زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ لائق توجہ ہے۔

سر فلپ سڈنی نے شاعری پر افلاطون سے لے کر اپنے زمانے کے گوسن تک کے اعتراضات اور الزامات کو پیش نظر رکھتے

---

(۱) تفصیل کے لیے محمد ھادی حسین کی مرتب کردہ کتاب ''مغربی شہریات'' میں شیلے کا مضمون ''شاعری کا جواز'' دیکھئے۔

(۲) تفصیل کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کی مذکورہ بالا کتاب میں میتھیو آرنلڈ کا مطالعہ ''شاعری کا مطالعہ'' دیکھئے۔

ہوئے ''شاعری کا جواز'' لکھا افلاطون نے شاعری کو اخلاقی نقطہ نظر سے مضر قرار دیا تھا۔ سڈنی نے اس الزام کے جواب میں یہاں تک کہہ دیا کہ شاعری کا مقصد اصلاح اخلاق ہے اور یہی تمام علوم کا آخری مقصد ہے۔ البتہ شاعری اور دوسرے علوم میں اتنا فرق ضرور ہے کہ شاعری مسرت انگیز طریقے سے ہدایت دیتی ہے گوسن نے افلاطون ہی کے اعتراض کو دھراتے ہوئے کہا تھا کہ شاعر جھوٹوں کے بادشاہ ہیں اور شاعری کذب وافترا کا دفتر ہے۔ سڈنی کا یہ نظریہ کہ شاعری کا مقصد اصلاح اخلاق ہے افلاطون اور گوسن دونوں کے اس اعتراض کو ختم کر دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ٹامس لوپیکوک نے شاعری پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا وہ یہ تھا کہ شاعری علم سے خالی ہوتی ہے۔ وہ محض توہم پرستی کو اکساتی اور جہل و تیرہ دماغی کو فروغ دیتی ہے لہٰذا ایک ایسے دور کو جو علم، عقل اور روشن خیالی کا دور ہے شاعری کی کوئی ضرورت نہیں۔ پیکوک کے جواب میں شیلے نے جو سب سے زیادہ زوردار بات کہی وہ یہ تھی کہ شاعری ''علم کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی۔ وہ سارے علوم انسانی پر حاوی ہے اور سارا علم انسانی اس سے سند اعتبار حاصل کرتا ہے''۔

آگے چل کر شیلے نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''شاعر دنیا کے وہ قانون ساز ہیں جن کا اعتراف نہیں کیا گیا''

شیلے کے مشہور مقالہ ''شاعری کا جواز'' لکھنے کے محرکات میں نہ صرف پیکوک بلکہ ویکو (۱۶۶۸۔۱۷۴۴) اور مشہور فلسفی ھیگل (۱۷۷۰۔۱۸۳۱) کے بھی بعض خیالات کو دخل رہا ہے ویکو اور ھیگل کے نزدیک بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''شاعری کا مستقبل سرے سے کچھ نہیں ہے۔ شاعری تہذیب انسانی کے بچپن کا کھلونا تھی اور اب ظاہر ہے کہ جب تہذیب انسانی کے بچپن کا کھلونا تھی اور اب ظاہر ہے کہ جب تہذیب اپنی بلوغت کو پہنچ چکی ہے تو اس میں شاعری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس نقطہ نظر کے نمائندے ویکو اور ھیگل ہیں۔ ھیگل نے تو اپنے دور میں شاعری کی موت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔''

شیلے نے اپنے مضمون میں نہ صرف شاعری کا جواز پیش کیا۔ بلکہ شاعری کے بارے میں اپنے ذاتی نظریے کا اظہار بھی کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ڈاکٹر سید عبداللہ ''اشارات تنقید'' صفحہ ۸۹ سے ۹۵ تک۔

جب انیسویں صدی کے انگریز شاعر ورڈزورتھ نے کہا تھا کہ شاعری علم کی روح رواں ہے تو غالباً اس کے ذہن میں بھی پیکوک کا یہ اعتراض موجود تھا کہ شاعری علم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

مذہب اور فلسفے کو شاعری پر ہمیشہ برتری حاصل رہی۔ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے شاعری کو سائنس کے مقابلے میں بھی ہیچ و پوچ سمجھا جانے لگا۔ اس صورت حال کے پیش نظر انگلستان کے عظیم نقاد میتھیو آرنلڈ کو کہنا پڑا کہ ''شاعری کے بغیر ہماری سائنس نامکمل دکھائی دے گی اور شاعری بہت سی ایسی چیزوں کی جگہ لے گی جنہیں ہم اب مذہب اور فلسفے کے نام سے پکارتے ہیں۔''

انیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے چار باتوں پر نظر رکھنا ہوگی۔

(۱) ایک تو شاعری کی مخالفت اور حمایت کے اس سلسلے پر جس کا آغاز افلاطون اور ارسطو سے ہوا۔

(۲) دوسرے انگلستان میں رومانی شاعری اور اس کے دو اہم ترین نمائندے ورڈزورتھ اور کیٹس کے نظریہ شعر پر

(۳) انیسویں صدی کے نصف آخر کے انگریز نقاد میتھیو آرنلڈ کے نظریہ شعر پر اور

(۴) فرانس میں علامتی شاعری کے ظہور پر۔ یہ ساری چیزیں کسی نہ کسی حد تک اردو شعر و ادب پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔

مغرب میں شاعری کی مخالفت اور حمایت سے جو نظریات برآمد ہوئے اوپر کی سطروں میں ان کی نشاندہی کر دی گئی اور ان کے تفصیلی مطالعے کے لیے متعلقہ مقالات کے عنوانات بتا دیئے گئے۔ مشرق میں شاعری کی مخالفت کبھی نہیں کی گئی لیکن انیسویں صدی کے آخر سے کبھی کبھی شاعری کی افادیت کو مشکوک ضرور سمجھا گیا ہے۔

ورڈزورتھ کے نظریہ شعر سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے محمد ھادی حسین کی مرتب کردہ کتاب ''مغربی شعریات'' میں ورڈزورتھ کے مجموعہ کلام Lyrical Ballads کے دیباچے کا ملخص ترجمہ ''شاعری اور شاعرانہ زبان'' پڑھیے۔

کیٹس کا نظریہ شعر کسی مقالے کی شکل میں نہیں بلکہ اس کے خطوط میں بکھرا ہوا ہے اس لیے اس کے نظریہ شعر پر اسی مطالعاتی رہنما میں روشنی ڈالی جائے گی۔

کیٹس کے نظریہ شعر سے پہلے ورڈزورتھ کے نظریہ شعر پر تھوڑی سی گفتگو ضروری ہے انگلستان میں رومانوی شاعری کا جو دور انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہو کر ۱۸۳۲ تک چلا اس نے پانچ بڑے شاعر پیدا کیے۔

(۱) ورڈزورتھ (۲) کالرج (۳) بائرن

(۴) شیلے (۵) کیٹس

## ۲۔ رومانوی شاعری اور اس کے دو ممتاز نمائندوں کے نظریات شعر

انگریزی شاعری کا رومانوی دور دراصل بغاوت تھا اٹھارھویں صدی کے انگریزی شعرا ڈرائڈن اور پوپ کی کلاسیکی شاعری سے۔ ڈرائڈن (۱۶۳۱۔۱۷۰۰) اور پوپ (۱۶۸۸۔۱۷۴۴) کے دور کو عقل کا دور کہا گیا ہے۔ انگریزی شاعری کا رومانی دور تخیل اور جذبے کا دور تھا۔ کلاسیکیت قدما کے اصولوں کی پیروی اور ان کے اصولوں سے مطابقت کا نام ہے۔ اس کے برعکس رومانیت ہر قسم کی پابندیوں سے بغاوت اور آزادی کا نام ہے۔ مقررہ اصولوں سے انحراف، دیہی زندگی سے دلچسپی، عام لوگوں کی زندگی

کی تصویر کشی، آزادی سے محبت، تخیل اور جذبے کا غلبہ، فطرت سے لگاؤ، زندگی کے مافوق الفطری پہلوؤں پر پراسراریت اور حیرت کا احساس ہر چیز کی طرف داخلی رویہ، رومانی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں سے ہے۔ رومانی شعرا میں ورڈزورتھ اور کیٹس کے نظریہ شعر خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

ورڈزورتھ ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے وفات پائی۔ جیسا کہ اس نے اپنے مجموعہ کلام کے دیباچے میں لکھا ہے، اس کے نزدیک تمام اچھی شاعری پرزور محسوسات کا بے ساختہ بہاؤ ہے، سچی شاعری فرمائش پر نہیں لکھی جا سکتی۔

شاعری کے بارے میں ورڈزورتھ کا ایک دوسرا اہم بیان یہ ہے کہ ''شاعری اس جذبے سے جنم لیتی ہے جسے ذہنی سکون کی حالت میں یاد کیا جاتا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی شاعری کسی واقعے کی طرف فوری ردعمل نہیں ہوتی۔

ورڈزورتھ کے ذہن میں شاعر کا تصور ایک ایسے انسان کا تصور ہے جو عام آدمیوں سے زیادہ حساس، پرجوش اور نرم طبع واقع ہوا ہے جو انسانی فطرت کا بہتر علم رکھتا ہے اور عام آدمیوں سے زیادہ جامع قسم کی روح۔ بڑا شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس نے زیادہ عرصے تک اور زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچا ہو۔ یہ تمام خوبیاں عام آدمیوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہیں لیکن جو چیز شاعر کو عام آدمیوں سے بالکل الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر اپنے تجربے کو مسرت بخش طریقے سے ظاہر کرتا ہے اور یہ کام عام آدمی انجام نہیں دے سکتا۔

ورڈزورتھ شاعری کو اخلاقیات سے آزاد تصور نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک شاعر ایک معلم ہے جو انسانی زندگی کی بہتری کے لیے شاعری کے ذریعے اخلاقی درس دیتا ہے۔ شاعری اخلاقی خیالات کی تبلیغ کا ایک وسیلہ ہے۔ اخلاقی خیالات سے بغاوت کی شاعری دراصل انسانی زندگی سے بغاوت کی شاعری ہے۔

ورڈزورتھ کے نظریہ شعر کی طرح شعری زبان کے بارے میں بھی اس کا نظریہ اہمیت رکھتا ہے۔ شعری زبان کے بارے میں اس نے اپنے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ: (۱) شاعری کی زبان ایسی ہونی چاہیے جسے لوگ واقعی استعمال کرتے ہوں لیکن یہ زبان ایسی زبان کا انتخاب ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمام الفاظ جو لوگوں کے استعمال میں آتے ہیں شاعری میں استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ (۲) شعری زبان ایسے لوگوں کی زبان ہونی چاہیے جو واضح ہیجان یا جوش کے عالم میں ہوں یعنی اس زبان میں تخیل کا رنگ ہونا چاہیے۔ (۳) نثر اور شاعری میں استعمال ہونے والے لفظوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔

کیٹس (۱۷۹۵۔۱۸۲۱ء) کا نظریہ شعر اپنے تمام معاصرین سے مختلف تھا۔ ورڈزورتھ نے شاعری کو اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ شیلے نے شاعری کو ہزاروں امراض میں مبتلا معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ بائرن نے شاعری کو طنز کے لیے

استعمال کیا اور اس کے ذریعے غلطیاں اور حماقتیں کرنے والے انسانوں کی گوشمالی کی، لیکن شاعری کی طرف کیٹس کا رویہ خالص فن کار کا رویہ رہا ہے اس شاعری سے نفرت جس کا کوئی واضح مقصد ہو۔ وہ شاعری کو سیاسیات اور عمرانیات سے وابستہ کرنے کے حق میں نہ تھا۔ اس کے نزدیک شاعری کا واحد مقصد حواس کو مسرت بہم پہنچانا تھا لیکن عمر کے آخری حصے میں شاعری کے متعلق اس کے انداز فکر میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری کو انسانی زندگی اور اس کے دکھ درد سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے نزدیک بلند ترین شاعری وہ تھی جو بلند ترین قسم کی صداقت کی ترجمان ہو۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کے اندر حقیقت یا صداقت کی جستجو بڑھتی گئی اور وہ شاعری اور فلسفے کے رشتے کو ڈھونڈھتا چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک عظیم شاعر کو عظیم مفکر بھی ہونا چاہیے۔

کیٹس کے نظریہ شعر کا ایک نہایت اہم جزو اس کا وہ نظریہ ہے جسے اس نے (Negative Capability) کہا ہے اور جس کا کوئی مناسب اردو ترجمہ ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

کیٹس نے اپنی اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب آدمی غیر یقینی باتوں، پراسرار باتوں اور شکوک کے درمیان ہو اور جب وہ حقیقت اور عقل تک نہ پہنچ سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر Negative Capability پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی ورڈزورتھ اور کالرج میں نہیں تھی البتہ شیکسپیئر کے یہاں وافر مقدار میں نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی کے عظیم فرانسیسی ناول نگار فلوبیر (۱۸۲۱۔۱۸۸۱) نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کا کوئی عظیم Genius قطعی نتائج تک پہنچا ہے نہ کوئی عظیم کتاب ایسا کرتی ہے کیونکہ خود انسانیت ہمیشہ جادہ پیما رہی ہے اور وہ کسی منزل تک نہیں پہنچے گی۔ ہومر نتائج تک نہیں پہنچتا، نہ شیکسپیئر نہ گوئٹے، یہاں تک کہ انجیل بھی نہیں۔

کیٹس اور فلوبیر کے ان خیالات کا مطلب یہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو اپنے نقطہ نظر، اپنے فکری نتائج کے بالکل صحیح ہونے پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔ انسانی زندگی نہایت پیچیدہ اور پراسرار شے ہے اس کے بارے میں صرف اظہار رائے کا خطرہ مول لیا جا سکتا ہے رائے میں قطعیت کا انداز نہیں ہونا چاہیے۔

کیٹس نے اپنے خطوط میں ایک جگہ اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ شاعر کو چاہیے کہ وہ اپنی شاعری کے انوکھے پن (

Singularity ) سے نہ چونکائے بلکہ شاعری میں وصف اضافی ( A Fine Excess ) سے چونکائے ۔وصف اضافی وہی چیز ہے جسے غالب نے چیز ے دیگر کہا ہے شاعری میں چیز ے دیگر سے مراد شاعری کی وہ خوبی ہے جس کو محسوس کیا جا سکے لیکن بیان نہ کیا جا سکے۔

## ۳۔ وکٹورین عہد کے عظیم نقاد میتھیو آرنلڈ کا نظریہ شعر

میتھیو آرنلڈ (۱۸۲۲_۱۸۸۸) انگلستان کا نہ صرف ایک اہم شاعر تھا بلکہ ایک عظیم نقاد بھی ۔وہ نہ صرف ادب کا نقاد تھا بلکہ انسانی زندگی کا نقاد بھی ۔اس کے ناقدانہ خیالات بیسویں صدی پر بھی اثر انداز رہے ہیں ۔اردو ادب کو بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں کہا جا سکتا۔

آرنلڈ کے نزدیک اعلیٰ ترین شاعری کی پہچان اس میں اعلیٰ سنجیدگی کی موجودگی ہے آرنلڈ کے اثر سے اردو ادب اور اردو تنقید میں بھی اعلیٰ سنجیدگی کی اصطلاح بہت استعمال ہوتی رہی ہے۔

آرنلڈ اس بات کا قائل تھا کہ شاعری کی شاندار قوت اس کی تعبیری قوت ہے ۔شاعری بنیادی طور پر زندگی کی تنقید ہے کسی شاعر کی عظمت اس سوال کے جواب میں پوشیدہ ہے کہ زندگی کس طرح بسر کی جائے اخلاقی خیالات سے بغاوت کی شاعری زندگی سے بغاوت کی شاعری ہے ۔اخلاقی خیالات کی طرف بے اعتنائی کی شاعری زندگی کی طرف بے اعتنائی کی شاعری ہے۔

شاعری کا مقصد نہ تو مسرت بخش جذبات پیدا کرنا ہے، نہ ذہنی لطف ولذت ۔اس کا مقصد اعلیٰ تر ہے شاعری انسان کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ زندگی کی تشریح کرتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے۔

شاعری میں ایک فطری جادو بھی ہے اور اخلاقی گہرائی بھی ۔ان دونوں باتوں کے اعتبار سے شاعری میں ایک تعمیری قوت پائی جاتی ہے یہ دونوں اعتبار سے انسان کی روح کو منور کرتی ہے ۔یہ اسے حقیقت کا ایک اطمینان بخش احساس عطا کرتی ہے ۔یہ انسان کے لیے اس کی ذات اور اس کی کائنات دونوں کو قابل قبول بنا دیتی ہے ۔

شاعری کی قوت سے آرنلڈ کی مراد یہ نہیں ہے کہ شاعری کائنات کی پراسراریت کی تشریح کرتی ہے بلکہ وہ چیزوں کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ ہمارے اندر نہ صرف چیزوں کا ایک بھرپور نیا اور گہرا احساس پیدا کر دیتی ہے بلکہ ان کے ساتھ ہمارے رشتوں کا بھی ۔نتیجتاً ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ چیزوں کی بنیادی فطرت سے ہمارا ربط پیدا ہو گیا ہے یہ ربط ایک فریب نظر ہے یا ایک حقیقت اس سے قطع نظر شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ وہ ہمارے اندر چیزوں کی بنیادی فطرت سے ربط کا احساس پیدا کر دیتی ہے ۔سائنس کی تعبیرات

ہمارے اندر وہ گہرا احساس پیدا نہیں کرتیں جو شاعری کی تعبیر کرتی ہے۔ سائنس کی تعبیرات ہماری محدود قوت کو متاثر کرتی ہیں نہ کہ پور ا آدمی کو۔

آرنلڈ کا خیال تھا کہ شاعری ہمارے لیے زندگی کی تعبیر پیش کرتی ہے ہمیں تسلی دیتی ہے اور ہمیں زندگی سہارنے کے لائق بناتی ہے۔ آرنلڈ کا یہ فقرہ کہ شاعری زندگی کی تنقید ہے ترقی پسند ادیبوں کا نہایت پسندیدہ نقطہ نظر رہا ہے جبکہ عہد حاضر کے ایک عظیم شاعر ڈبلیو ٹیس (۱۹۳۹۔۱۸۶۵) نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس خیال کو مسترد کر دیں گے کہ شاعری زندگی کی تنقید ہے اور اس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ شاعری ایک مخفی زندگی کا انکشاف ہے۔

آرنلڈ کے شعری اور ادبی نظریے سے متعلق مزید معلومات کے لیے آرنلڈ کا مقالہ شاعری کا مطالعہ (ارسطو سے ایلیٹ تک) میں اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''اشارات تنقید'' میں ''آرنلڈ'' پڑھیے۔

## ۴۔ علامتی شاعری اور اس کے نمائندوں کے نظریات شعر

انیسویں صدی کی مغربی شاعری میں شاعری کے جو دو عظیم نظریے دو عظیم روایتیں اور عظیم تحریکیں ملتی ہیں ان میں سے ایک تو انگلستان کی رومانوی شاعری ہے اور دوسری فرانس کی علامتی شاعری۔ رومانوی شاعری کا دور ۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۲ء تک رہا اور علامتی شاعری انیسویں صدی کے وسط میں فرانس میں شروع ہو کر بیسویں صدی میں ایک عالمگیر روایت اور عالمگیر تحریک بن گئی۔ علامت نگاری صرف شاعری تک محدود نہیں رہی بلکہ بعض دوسری اصناف ادب میں بھی سرایت کر گئی خصوصاً ناول، افسانے اور ڈرامے میں۔

اٹھارھویں صدی کی انگریزی شاعری کی کلاسیکیت کے ردعمل کے طور پر انیسویں صدی میں رومانیت نے جنم لیا تھا۔ رومانیت کے ردعمل کے طور پر علامت نگاری وجود میں آئی وہ کچھ رومانوی شعرا ہی تھے جو رومانیت کو ورڈورتھ اور بائرن سے آگے لے گئے اور علامت نگاری کے پیش رو بن گئے ان میں سے ایک کا نام گیرارڈی نرول ہے جو اس رومانی نظریے کا سخت مخالف تھا کہ آرٹ کا کوئی اخلاقی یا افادی مقصد ہونا چاہیے۔ اس نے رومانیت پر اس لیے بھی حملہ کیا کہ اس میں جھوٹی جذباتیت حد سے بڑھی ہوئی داخلیت اور ہیئت کے احساس کا فقدان پایا جاتا ہے۔

علامت نگاری کے معاملے میں گیرارڈی نرول سے بھی زیادہ اہم شخصیت ایڈگر الن پو کی ہے جو انیسویں صدی کا ایک امریکی شاعر تھا۔

انیسویں صدی کے وسط میں امریکہ کے رومانی اہل قلم۔ پو، ہاتھورن، میلول وھٹمین اور ایمرسن بھی علامت نگاری کی سمت میں گامزن تھے۔

علامتی تحریک کی ابتدائی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ فرانسیسی شاعر بودلیر (۱۸۲۱_۱۸۶۷) کا امریکی شاعر اور افسانہ نگار ایڈگر الن پو (۱۸۰۹_۱۸۴۹) کو دریافت کرنا ہے بودلیر نے پو کو سب سے پہلے ۱۸۴۷ میں پڑھا اور ۱۸۵۲ء میں اس نے پو کی کہانیوں کے فرانسیسی تراجم کا ایک مجموعہ شائع کیا۔اس زمانے سے فرانسیسی ادب میں پو کے اثر نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

پو کی تنقیدی تحریروں نے علامتی تحریک کا پہلا صحیفہ فراہم کیا۔اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ عدم وضاحت شاعری کی سچی موسیقی کا ایک عنصر ہے ایک ایسی عدم وضاحت جو مبہم ہو اور اپنے اندر روحانی اثر رکھتی ہو۔علامت نگاری کا ایک خاص مقصد موسیقی کی عدم وضاحت کے قریب پہنچنا ہے۔

عدم وضاحت کا اثر صرف تخیلی اور حقیقی دنیاؤں کو خلط ملط کرنے سے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ مختلف حواس کے احساسات کو گڈمڈ کر کے بھی پیدا کیا گیا، مثلاً پو اپنی ایک نظم میں اندھیرے کے قریب آنے کی آواز سن رہا ہے۔اس طرح کی جدتوں نے فرانس میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

جس چیز نے پو کو فرانسیسوں کے لیے خاص طور پر قابل قبول بنا دیا وہ تھا جمالیاتی نظریے سے پو کی دلچسپی۔انگریزوں سے کہیں زیادہ فرانسیسیوں نے ادب کے بارے میں ہمیشہ بحث و تمحیص کی ہے۔پو کے ادبی نظریوں پر اگر کہیں بحث ہوئی تو فرانس ہی میں ہوئی۔

علامت نگاری کی روایت میں ملارے (۱۸۴۲_۱۸۹۸) اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر تھا۔اس نے فرانس اور انگلستان دونوں ملکوں کے نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا اس سے متاثر ہونے والوں میں مغربی ادب کی متعدد غیر فانی شخصیتیں ہیں۔

ملارے کا مشہور قول ہے کہ ''کسی چیز کا نام لینا نظم کی ایک تہائی لذت کو غارت کر دیتا ہے۔نظم کی اصل لذت اس کے معنی کا آہستہ آہستہ اندازہ کرنے میں ہے۔نظم میں جو چیز تخیل کے لیے دل آویز ہے وہ ہے کسی چیز کا نام لینے کی بجائے اس کی طرف اشارہ کرنا ،اس سے متعلق جذبات کو ابھارنا۔

علامت نگاری کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انیسویں صدی سے شروع ہوئی ہو۔دنیا کے تمام قدیم ادب میں علامتوں کا استعمال موجود ہے لیکن پرانی علامت نگاری اور جدید علامت نگاری کا ایک نہایت اہم فرق یہ ہے کہ پرانی علامتوں کے معنی مقرر تھے جبکہ نئی علامتیں بالکل آمرانہ انداز میں استعمال کی جاتی ہیں یعنی شاعر یا ادیب جس علامت کو جن معنوں میں چاہیے استعمال کر سکتا ہے۔

علامتوں کے اس طریق استعمال سے علامتی شاعری اور علامتی ادب میں بڑا ابہام پیدا ہو گیا ہے علامتی شاعری اور علامتی ادب میں ابہام اور پراسراریت کی فضا عام ہے جدید نقادوں نے اس ابہام اور پراسراریت کی توجیہہ اور جواز میں بہت کچھ لکھا ہے جس سے ہر جگہ اتفاق کرنا ممکن نہیں۔تفصیل کے لیے دیکھئے نظیر صدیقی کی کتاب ''اردو ادب کے مغربی دریچے'' میں وہ مضمون جس کا عنوان ہے ''اظہار یا ابلاغ''

امریکی نقاد ایڈمنڈ ولسن نے کہا ہے کہ ہمارے زمانے (بیسویں صدی) کی ادبی تاریخ بڑی حد تک علامت نگاری کے نشو ونما کی تاریخ ہے۔ جہاں فرانس میں والری جیسے شاعر اور پروست جیسے ناول نگار علامتی تحریک سے پیدا ہوئے ہیں، وہاں انگریزی میں کیٹس اور ایلیٹ جیسے شاعر اور جوائس جیسے ناول نگار بھی اسی علامتی تحریک کی پیداوار ہیں۔

## ۵۔ اردو شعر وادب پر رومانی شاعری اور علامتی شاعری کے اثرات

اردو ادب انیسویں صدی کی ان دونوں مغربی تحریکات (رومانیت اور علامت نگاری) سے بہت متاثر ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں آزاد اور حالی نے جس جدید شاعری کی بنیاد رکھی اور جس کے زیر اثر فطرت کے مناظر اور مظاہر پر نظم نگاری کا رواج شروع ہوا اس میں انگلستان کی رومانی شاعری کے اثرات کو کسی نہ کسی حد تک ضرور دخل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اردو شاعری صحیح معنوں میں کوئی ورڈز ورتھ، کیٹس یا شیلے پیدا نہ کر سکی لیکن مجموعی طور پر انگلستان کی رومانوی شاعری کا اثر اردو شاعری پر دیر تک رہا ہے۔ آزاد اور حالی کے بعد کی نسلوں میں علامہ اقبال سے لے کر اختر شیرانی اور فیض احمد فیض جیسے شعرا تک رومانیت کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ رومانیت کا اثر اردو نثر نگاروں پر بھی رہا ہے جس کی تفصیل آپ اسی کورس کے یونٹ نمبر ۲ میں دیکھیں۔

جہاں تک علامت نگاری کا تعلق ہے اس سے اردو شاعری بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے متاثر ہونا شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور سب سے اہم نام میرا جی کا ہے جو فرانس کے علامت نگار شعرا سے متاثر ہوئے۔ میرا جی کے ساتھ اور بعد کے شاعروں میں تصدق حسین خالد، ن م راشد، فیض، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، مجید امجد، افتخار جالب، جیلانی کامران، سلیم الرحمان، عباس اطہر، انیس ناگی، زاہد ڈار، وزیر آغا، احمد شمیم، اور آفتاب اقبال شمیم وغیرہ نمایاں ہیں۔

جہاں تک اردو نثر کا تعلق ہے، ۱۹۶۰ سے لے کر اب تک اردو افسانوں علامتی تحریک کے زیر اثر رہا ہے اس روایت کے زیر اثر لکھنے والوں میں انتظار حسین، انور سجاد، مسعود اشعر، خالدہ حسین، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، منشا یاد، مظہر الاسلام، احمد داؤد، رخسانہ صولت اور اعجاز راہی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غرضیکہ بیسویں صدی کے اردو ادب کی تحسین و تفہیم کے لیے کم از کم انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے مغرب کی اہم ادبی تحریکات سے واقفیت ضروری ہے۔

## ۶۔ مطالعے کے لیے مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | ارسطو سے ایلیٹ تک | ڈاکٹر جمیل جالبی |
| ۲۔ | مغربی شعریات | محمد حادی حسین |
| ۳۔ | ارشادات تنقید | ڈاکٹر سید عبداللہ |
| ۴۔ | اردو ادب کے مغربی در یچے | نظیر صدیقی |
| ۵۔ | علامت نگاری (مقالہ) | ایڈمنڈ ولسن |
| ۶۔ | جدید فرانسیسی شاعری (مقالہ) | والیس فاؤلی |

### امدادی کتابوں کی فہرست

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | جدید اردو شاعری میں علامت نگاری | ڈاکٹر تبسم کاشمیری |
| ۲۔ | نظم جدید کی کروٹیں | ڈاکٹر وزیر آغا |
| ۳۔ | تاریخ ادب انگریزی | ڈاکٹر محمد احسن فاروقی |

## ۷۔ خود آزمائی

۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مغرب میں شاعری ہمیشہ مخالفت کی زد میں رہی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو شاعر اور شاعری کے خلاف مغربی فلسفیوں اور نقادوں کے الزامات کا جائزہ لیجیے؟

۲۔ افلاطون کا تصور حقیقت کیا تھا اور اس کے نزدیک شاعری حقیقت سے کتنی دور تھی؟

۳۔ شاعری پر پیکوک کا بنیادی اعتراض کیا تھا اور اس کے جواب میں ورڈزورتھ، شیلے اور میتھیو آرنلڈ نے کیا کہا؟

۴۔ رومانوی شاعری کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

۵۔ شاعری کے بارے میں ورڈزورتھ کے خیالات کیا تھے؟

۶۔ شاعری میں وصف اضافی سے کیٹس کی مراد کیا ہے؟

۷۔ کیا علامتی شاعری کو رومانوی شاعری کا ردعمل کہا جا سکتا ہے اور اگر کہا جا سکتا ہے تو کس اعتبار سے؟

۸۔ علامتی شاعری کا پہلا صحیفہ کس امریکی شاعر نے فراہم کیا؟ اس صحیفے کی بنیاد کس نظریے پر تھی؟

۹۔ شاعری کے بارے میں ملارمے کے خیالات کیا ہیں؟

۱۰۔ کیا رومانوی اور علامتی شاعری کی تحریکیں اردو نثر پر بھی اثر انداز ہوئیں اور اگر ہوئیں تو کس کس دور کے کن اصناف ادب پر ہوئیں؟

یونٹ ۱۳۔۱۴

# بیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر

تحریر: نظیر صدیقی

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کے مقاصد | 109 |
| ۱۔ | بیسویں صدی میں مغربی شاعری کی تحریکات | 109 |
| ۲۔ | بیسویں صدی میں مغربی شاعری کے مسائل | 113 |
| ۳۔ | خالص شاعری | 114 |
| ۴۔ | پورا آدمی | 115 |
| ۵۔ | سائنس اور شاعری | 116 |
| ۶۔ | روایت اور جدیدیت | 117 |
| ۷۔ | مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست | 118 |
| ۸۔ | خود آزمائی | 119 |

# یونٹ کے مقاصد

عزیز طلبا وطالبات

مطالعاتی رہنما کے ان یونٹوں کا موضوع ''بیسویں صدی میں مغرب کے نظریات شعر'' ہے۔

ان یونٹوں کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آپ کو بیسویں صدی میں مغرب کی شہری تحریکات سے آشنا کرانا۔

۲۔ ان تحریکات کے بنیادی نظریات سے روشناس کرانا۔

۳۔ ان مسائل سے واقفیت پیدا کرانا جن سے بیسویں صدی کی مغربی شاعری دوچار رہی ہے۔

## ۱۔ بیسویں صدی میں مغربی شاعری کی تحریکات

جیسا کہ آپ نے مطالعاتی رہنما کے یونٹ نمبر ۱۱۔۱۲ میں پڑھا، انیسویں صدی کے دو شعری نظریے یعنی رومانوی شاعری اور علامتی شاعری بیسویں صدی کے اردو ادب پر ابھی تک اثر انداز ہیں۔ بیسویں صدی کی مغربی شاعری میں کئی تحریکیں پیدا ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی رومانوی شاعری اور علامتی شاعری کی طرح دیرپا اور دوررس ثابت نہ ہوئی۔

مثلاً ۱۹۱۵ میں امیجزم نام کا ایک شعری نظریہ اور ایک شعری تحریک نے جنم لیا جس کے نمائندوں میں ایذرا پاؤنڈ ٹی ایس ایلیٹ اور میرین مور جیسے امریکی شعرا بھی ہیں اور ایڈتھ سٹول، ڈی ایچ لارن اور ہیوم جیسے انگریزی شعرا بھی۔

اس نظریے کے بنیادی اصول یہ تھے:

۱۔ شاعری میں عام گفتگو کی زبان استعمال کرنا لیکن بالکل صحیح لفظ نہ کہ آرائشی لفظ استعمال کرنا۔

۲۔ نئی ذہنی کیفیات کے اظہار کے لیے شاعری میں نئے آہنگ تخلیق کرنا۔

۳۔ موضوع کے معاملے میں مکمل آزادی دینا۔

۴۔ موضوع کی ایک تصویر پیش کرنا۔ شاعری کا فریضہ کسی چیز کی خصوصیات کو صحیح طور پر پیش کرنا ہے، نہ کہ مبہم قسم کی عام باتوں کو پیش کرنا۔

۵۔ ایسی شاعری تخلیق کرنا جو ٹھوس اور واضح ہو، نہ کہ دھندلی اور غیر واضح

۶۔ شاعری کی روح اس کے ارتکاز میں ہے۔

امریکی امیجزم کوفرانسیسی سمبلزم (علامت نگاری) کا شعوری ردعمل کہا گیا ہے۔امیجزم کا بنیادی اصرار یہ تھا کہ احساسات کی نہایت واضح تصویریں پیش کی جائیں،خصوصاً بصری احساسات کی جن میں کوئی رومانی دھندلا پن نہ ہو امیجزم نے افکار وخیالات سے دامن بچایا۔امیجزم کی عمر بہت مختصر رہی۔شاعری کا خیال سے خالی ہونا ممکن نہیں۔

۱۹۱۶ء میں فرانسیسی شاعری میں ڈاڈاازم (Dadaism) کا نظریہ اور تحریک آئی۔پہلی جنگ عظیم کے دوران زیورچ میں اس تحریک کی بنیاد ان نوجوانوں کے ہاتھوں پڑی تھی جو مختلف قوموں کے جلاوطن تھے۔یہ تحریک عالمی حالات سے برگشتگی،بوریت اورانفرادی خودنمائی اور خوداشتہاری کے جذبے سے پیدا ہوئی تھی۔

اس تحریک کے سب سے ممتاز ترجمان فرانسیسی شاعر Tristan Tzara ٹرسٹن زارا (۱۸۹۶۔۱۹۶۳) نے اس تحریک کے منشور (۱۹۱۸) اور ''ڈاڈا'' پر لکچر (۱۹۲۲) میں کہا کہ ڈاڈا تجریدیت کا سائن بورڈ ہے اشتہار بازی اور کاروبار بھی شاعری کے عناصر میں سے ہیں۔ڈاڈا ازم کی بنیاد انکار اور بیزاری پر تھی۔ڈاڈا ازم نے ہر چیز سے برگشتگی اور بیزاری کا اظہار اور اس کی معنویت اور افادیت سے انکار کیا۔یہ تحریک ہر چیز کی نفی تھی۔منطق کے فلسفے کی' مذہب کی' اخلاق کی،آرٹ کی،علم کی،اقدار کی۔

ادب اور آرٹ پر فرائڈ کے نظریات کے اطلاق کے باعث سرریلزم کے حامی خوابوں اور خودکار تحریروں کو بڑی اہمیت دینے لگے اس تحریک کا ایک مقصد انسانی فطرت کو پہلے سے زیادہ صحیح اور مکمل طریقے پر ظاہر کرنا تھا۔

ڈاڈا ازم کی طرح سرریلزم بھی ہر چیز سے بغاوت تھی قومیت سے بغاوت،معاشرے سے بغاوت،ذہنی اور اخلاقی اقدار سے بغاوت یہاں تک کہ آرٹ سے بغاوت۔سرریلزم کی تحریک بھی دو چار سال کے اندر ہی ختم ہو گئی۔

ڈاڈا ازم مکمل طور پر منفی تحریک تھی لیکن سرریلزم تحت الشعور کی مثبت اور شفا بخش قوت پر یقین رکھتی تھی۔ڈاڈا ازم اور سرریلزم کے اثرات اس اعتبار سے دوررس تھے کہ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دھائی میں ابھرنے والی (Thratre of the Absurd) کی تحریک کے ڈانڈے ان دونوں تحریکوں سے ملتے ہیں۔ایبسرڈ ڈرامہ نگاروں میں سیموئل بیکٹ،آیونیسکو،ژان ژے اور ہیرولڈ پنٹر وغیرہ پر ان تحریکوں کے اثرات مرتب ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں پیرس میں آندرے مالرو،روم میں رولاں اور گورکی کی رہنمائی میں ادیبوں کی جو بین الاقوامی کانفرنس ہوئی اور اس میں انفرادیت کو خیرباد کہہ کر اجتماعی سطح پر کام کرنے،ادیبوں کی آزادی رائے کو محفوظ کرنے اور محنت کش طبقے کا تعاون حاصل کرنے کے جو فیصلے کیے گئے وہ ایک عالمگیر ترقی پسند تحریک کی بنیاد بن گئے جس نے ادب کی تمام اصناف کو متاثر کیا۔چونکہ ترقی پسند تحریک بنیادی طور پر کوئی شہری تحریک نہیں تھی،اس لیے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ویسے اس تحریک نے ساری دنیا کی شاعری میں وضاحت (ابہام کی ضد) خطابت اور خارجیت ضرور پیدا کی۔

اگر چہ ڈاڈا ازم فلسفے کی بھی نفی تھی لیکن اس کی بنیاد بھی ایک فلسفے پر تھی اس فلسفے کی رو سے منطق کوئی چیز نہیں۔زندگی کے اعمال کا نہ کوئی آغاز ہے نہ اختتام۔ہر چیز بالکل احمقانہ طریقے سے معرض وجود میں آتی ہے۔اس لیے تمام چیزیں یکساں ہیں سادگی کا دوسرا نام ڈاڈا ہے ڈاڈا ازم کا آغاز کسی آرٹ کا آغاز نہیں تھا بلکہ ایک برگشتگی کا آغاز تھا۔فلسفیوں کی شان وشوکت سے برگشتگی جو تین ہزار سال سے ہر چیز کی توجیہ کرتے رہے ہیں (نہ جانے کس مقصد سے )ان فن کاروں نے برگشتگی جو روئے زمین پر اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ سمجھتے رہے ہیں جذبات اور انسان کی مریضانہ بداعمالی اور بدکاری سے برگشتگی غلط قسم کے غلبے اور پابندیوں سے برگشتگی ڈاڈا ازم ان برگشتگیوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتی۔اس نے ہر چیز سے لڑنا جھگڑنا بھی ترک کر دیا ہے یہ سوچ کر کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے ڈاڈا ازم ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔زندگی میں ہر چیز کی طرح ڈاڈا ازم بے سود ہے۔یہ کوئی دعوی نہیں کرتی کوئی ڈینگ نہیں مارتی۔

۱۹۲۱اور۱۹۲۲کے دوران پیرس میں سرریلزم (Surrealism) وجود میں آئی جب آندرے بریتاں اور دوسرے فرانسیسی اہل قلم ڈاڈا ازم سے الگ ہو گئے۔

اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ شاعری یا ادب میں خیال کو اس کی اصلی شکل میں ظاہر کیا جائے یعنی خیال کو ہر اس پابندی سے الگ کر کے پیش کیا جائے جو عقل یا جمالیات اور اخلاقیات اس پر عائد کرتی ہے۔

اس نظریے کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ اعلیٰ ترین قسم کی حقیقت لاشعور میں رہتی ہے اور قبل اس کے کہ شعوری ذہن اسے مسخ کرے اسے گرفت میں لانے کی کوشش کی جائے۔

اس نظریے میں لاشعور پر جو زور ہے اور شعور سے اس کی جو آمرانہ علیحدگی ہے، وہ فرائڈ (۱۹۳۹۔۱۸۸۶) کے نظریات کا اثر ہے۔

## ۲۔ بیسویں صدی میں مغربی شاعری کے مسائل

بیسویں صدی میں مغرب شاعری کے جن مسائل سے دوچار رہا ہے ان میں ایک تو وہ مسائل ہیں جنھوں نے امیجزم، ڈاڈا ازم اور سرریلزم جیسی تحریکیں پیدا کیں، جنھوں نے شاعری کو نہایت واضح ،ٹھوس اور حقیقت سے زیادہ سے زیادہ قریب بنانے کی کوشش کی۔دوسرے وہ مسائل ہیں جو شاعری کے جواز سے متعلق مغرب میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔بیسویں صدی میں بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ شاعری کو بے ضرورت ثابت کرنے کے لیے ویکو اور ھیگل جیسی مقتدر شخصیتوں نے جو خیالات اور نظریات پیش کیے ان کی تردید کر کے شاعری کا جواز فراہم کیا جائے۔

بیسویں صدی کے مغرب میں شاعری کے جواز پر دو مقالے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ایک تو اطالوی مفکر بنی ڈیٹو

کروچے (۱۹۵۲۔۱۸۶۶) کا مقالہ ''شاعری کا جواز'' جو ۱۹۳۳ میں لکھا گیا۔ دوسرے انگریز نقاد آئی اے رچرڈز (۱۸۹۳۔۔۔) کا مقالہ ''سائنس اور شاعری'' جو ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا۔ آپ ان دونوں مقالوں کے اردو ترجمے ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں پڑھیں۔

اٹھارویں صدی کے اطالوی مفکر ویکو (۱۷۴۴۔۱۶۶۸) نے کہا تھا کہ پورے طور پر ترقی یافتہ ذہن میں شاعری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور انیسویں صدی کے عظیم جرمن مفکر ہیگل نے شاعری کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس قسم کے اعتراضات کا جواب انیسویں صدی میں جرمنی کے شاعر شلر (۱۸۰۵۔۱۷۵۹) اور انگلستان کے شاعر شیلے (۱۸۲۲۔۱۷۹۲) نے دیا تھا۔ کروچے نے شیلے کے جواب کو کلاسیکل (جس کے معنی ہیں نہایت اہم اور ہر دور میں کارآمد) قرار دینے کے باوجود ۱۹۳۳ میں شاعری سے متعلق اعتراضات سے ازسرنو نبٹنا ضروری سمجھا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے مضمون میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں جو نئی اور خیال انگیز ہیں۔ کروچے کے یہ خیالات غور طلب ہیں کہ:

''ہماری تہذیب تکنیکی اعتبار سے کامل اور روحانی اعتبار سے وحشی ہے۔ وہ دولت کی خواہاں اور نیکی سے غافل ہے۔ یہ وہ کثیف فضا ہے جس میں ہمارا دم گھٹ رہا ہے جو دل کی آزادی کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اگر شاعری کی تازہ بارش اس پر ہو جائے تو وہ کیسی تفریح، کیسا تفنن، کیسی وسعت ہوا اور کیسی عظیم روح کو بیدار کرے گی''۔

لیکن بقول ڈاکٹر جمیل جالبی کروچے اپنے دور کی اس شاعری کو رد کر دیتا ہے جس نے تازہ بارش کا کام نہ کر کے روح کی زندگی پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ اسی لیے ''خالص شاعری'' کو رد کر کے اسے شاعری کا ایک نیا فیشن کہتا ہے۔

## ۳۔ خالص شاعری

''خالص شاعری'' کیا ہے؟ اس کے بارے میں عہد حاضر کے ممتاز انگریز نقاد ہربرٹ ریڈ نے بتایا ہے کہ یہ شاعری کی ایک قسم ہے جو گزشتہ دو تین نسلوں کے اندر صرف فرانس میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ ورلین (۱۸۹۴۔۱۸۴۴) اور ملارے (۱۸۹۸۔۱۸۴۲) سے شروع ہوئی اور پال والبری (۱۹۴۵۔۱۸۷۱) کے ساتھ ختم ہو گئی اس شاعری کا نظریہ اور نمونہ دونوں انگریزی اور امریکی ادب میں موجود تھے۔ جب انگریز نقاد والٹر پیٹر (۱۸۹۴۔۱۸۳۹) نے کہا تھا کہ ''تمام فنون موسیقی کی کیفیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں'' یا جب امریکی شاعر ایڈگر الن پو (۱۸۴۹۔۱۸۰۸) نے کہا تھا کہ ''جب موسیقی کے ساتھ مسرت بخش خیال مل جاتا ہے تو شاعری پیدا ہوتی ہے۔ خیال کے بغیر موسیقی صرف موسیقی رہتی ہے۔ خیال میں اگر موسیقی شامل نہ ہو تو وہ نثر ہے۔''

غرضیکہ ''خالص شاعری'' کی تحریک شاعری کو بالکل موسیقی بنانے کی کوشش تھی۔ کروچے کہتا ہے کہ ''شاعری محض موسیقی

نہیں ہے اور موسیقی محض آوازوں کا نام نہیں ہے ۔موسیقی کی اپنی روح ہوتی ہے ۔یہ ایک فریب ہے کہ ایک نظم ہمیں آوازوں سے متاثر کرتی ہے اور یہ آوازیں ہمارے کانوں کو وجد میں لے آتی ہیں ۔دراصل وہ جس چیز کو وجد میں لاتی ہیں وہ قوت تخیل ہے اور یہ قوت ہمارے جذبے کو وجد میں لے آتی ہے ۔

## ۴۔ پورا آدمی

کروچے نے اپنے مضمون ''شاعری کا جواز'' میں ایک بہت اہم سوال اٹھایا ہے وہ یہ کہ اگر شاعری وجدان اور اظہار سے عبارت ہے اور اگر شاعری امیجری (تصویر کاری) اور آواز کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے تو وہ کون سا مواد ہے جو آواز اور امیجری کی صورت اختیار کرتا ہے؟ کروچے اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ :

''وہ پورا آدمی ہے ۔وہ آدمی جو سوچتا ہے، ارادہ کرتا ہے، محبت اور نفرت کرتا ہے، جو طاقتور بھی ہے اور کمزور بھی ، جو عظیم بھی ہے اور ستم رسیدہ بھی، جو اچھا بھی ہے اور برا بھی ۔وہ آدمی جو زندگی کی خوشیوں اور غموں میں پھنسا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ آدمی جو اس میں پیوست ہے''۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے صحیح کہا ہے کہ پورے آدمی کا تصور کروچے کے ہاں تخلیق کا بنیادی تصور ہے ۔شاعری کے جواز میں کروچے کے خیالات شلر اور شیلے کے خیالات سے زیادہ متوازن اور زیادہ زوردار معلوم ہوتے ہیں ۔

## ۵۔ سائنس اور شاعری

شاعری پر جس جس رخ اور جس جس حوالے سے حملہ کیا گیا ہے اس میں ایک رخ اور حوالہ سائنس کا بھی ہے سائنس کوئی نئی چیز نہیں ہے ۔انسانی شعور اور سائنس کا آغاز ایک ساتھ ہوا ہے لیکن سترھویں صدی سے سائنس کی ترقی میں جو تیز رفتاری آئی ہے وہ وقت کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی ہے ۔شاید جتنی سائنسی ایجادات صرف بیسویں صدی کی ہیں اتنی اس سے پہلے کی تمام صدیوں کو ملا کر بھی نہیں ہیں ۔سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں شعر و ادب کی افادیت اور قدر و قیمت مشکوک ہو کر رہ گئی ہے ۔اس لیے ضروری تھا کہ کوئی صاحب بصیرت شاعری اور سائنس کے باہمی رشتے کو مستحکم کرے اور سائنس کی روز افزوں اہمیت کے باوجود شاعری کی اہمیت کا اثبات کرے ۔عہد حاضر میں یہ کام انگریز نقاد اور ماہر نفسیات آئی ۔اے رچرڈز نے انجام دیا ہے ۔

رچرڈز کے اس مضمون کو سمجھنے کے لیے آپ ڈاکٹر عبداللہ کی کتاب ''اشارات تنقید'' میں وہ صفحات پڑھیں جو رچرڈز پر لکھے

گئے ہیں ڈاکٹر عبداللہ نے بڑی خوبصورتی اور اختصار کے ساتھ رچرڈز کے نظام فکر، نظریہ شعر اور سائنس اور شاعری کے رشتے کے بارے میں اس کے موقف کو بیان کیا ہے۔ رچرڈز نے اپنے مضمون میں دو اہم سوالات اٹھائے ہیں ۔۔۔۔۔۔(۱) شاعری کیا ہے؟ (۲) اس کی قدر و قیمت یا اہمیت کیا ہے؟ جیسا کہ ڈیوڈ ڈیشز نے کہا ہے رچرڈز کی سائنس نفسیات ہے۔ وہ اپنے نفسیاتی نقطہ نظر سے مذکورہ سوالوں پر بحث کرتے ہوئے اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ شاعری نہ صرف اندرونی انتشار پر قابو پانے کا ایک ذریعہ ہے بلکہ وہ تہذیب کو بچانے کا ایک بنیادی ذریعہ ہے ورنہ اس کا مستقبل مخدوش ہے۔

## ۶۔ روایت اور جدیدیت

بیسویں صدی میں جہاں ایک طرف سائنس کی روز افزوں ترقی نے شاعری کی قدر و قیمت کو مشکوک بنا دیا وہاں دوسری طرف شاعروں کی جدیدیت پسندی نے روایت کی اہمیت کو اس حد تک مشتبہ بنا دیا کہ روایت اور روایتی جیسے الفاظ تحقیر آمیز انداز میں استعمال کیے جانے لگے۔

ٹی ایس ایلیٹ (۱۸۸۸۔۱۹۶۵) جو عہد حاضر کے جدید شاعروں کے عظیم اماموں میں سے ہیں انھوں نے روایت کی دفاع میں ''روایت اور انفرادی صلاحیت'' کے عنوان سے ۱۹۱۷ میں اک عہد آفریں مقالہ لکھا جس میں یہ بتایا کہ منفرد ہونے کے معنی غیر روایتی ہونے کے نہیں ہیں بلکہ جو شاعر جتنا منفرد ہوگا وہ اتنا ہی روایت سے وابستہ ہوگا۔ روایت کا تعلق صرف ماضی سے نہیں ہوتا بلکہ وہ حال اور مستقبل کی تشکیل میں بھی کارفرما ہوتی ہے۔ آپ ایلیٹ کے اس مضمون کا اردو ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں پڑھیں اور اسے سمجھنے کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کے تعارف کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''اشارات تنقید'' میں ایلیٹ سے متعلق باب پر بھی نظر ڈالیں۔

اس مطالعاتی رہنما کے مطالعے سے آپ پر واضح ہو گیا کہ بیسویں صدی میں مغرب کے نظریہ شعر کن مرحلوں سے گزرے ہیں شعری نظریات نے کن تحریکات کو جنم دیا ہے اور کن مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

## ۷۔ مجوزہ مقالوں اور کتابوں کی فہرست

۱۔ شاعری کا جواز

کروچے (ارسطو سے ایلیٹ تک) از ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۔ سائنس اور شاعری

آئی اے رچرڈز (ارسطو سے ایلیٹ تک)

۳۔ روایت اور انفرادی صلاحیت

ٹی ایس ایلیٹ (ارسطو سے ایلیٹ تک)

۴۔ ایلیٹ

ڈاکٹر سید عبداللہ ''اشارات تنقید''

۵۔ ارسطو سے ایلیٹ تک

ڈاکٹر جمیل جالبی

۶۔ اشارات تنقید

ڈاکٹر سید عبداللہ

۷۔ تاریخ ادب انگریزی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

۸۔ جھلکیاں (حصہ اول)

محمد حسن عسکری

## ۸۔ خودآزمائی

۱۔ انیسویں صدی کے مغرب کے کون سے شعری نظریے بیسویں صدی کے ادب پر ابھی تک اثر انداز ہیں؟

۲۔ ایسی شاعری تخلیق کرنا جو ٹھوس اور واضح ہو نہ کہ دھندلی اور غیر واضح کس شعری نظریے کا نصب العین تھا؟

۳۔ ڈاڈا ازم کی نمایاں ترین خصوصیت کیا تھی؟

۴۔ سررئیلزم کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

۵۔ ویکو اور ھیگل نے شاعری کے بارے میں کیا کہا تھا؟

۶۔ پورے آدمی کا تصور کس مفکر کے ہاں تخلیق کے بنیادی تصور کی حیثیت رکھتا ہے اور اس تصور کا مفہوم کیا ہے؟

۷۔ آئی اے رچرڈز شاعری کو کس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے؟

۸۔ رچرڈز شاعری کو زیادہ اہمیت دیتا ہے یا سائنس کو اور ایسا کیوں؟

۹۔ ٹی ایس ایلیٹ روایت کا حامی ہے یا مخالف؟ اس کی حمایت یا مخالفت کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

۱۰۔ شعری روایت شاعر کو ورثے میں ملتی ہے یا اسے حاصل کرنی پڑتی ہے؟ اس کے بارے میں ایلیٹ کے خیال کی وضاحت کریں؟

یونٹ ۱۵۔۱۶

# حقیقت نگاری، فطرت نگاری اور شعور کی رو

تحریر: نظیر صدیقی

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کے مقاصد | 123 |
| ۱۔ | حقیقت نگاری اور فطرت نگاری | 123 |
| ۲۔ | شعور کی رو | 131 |
| ۳۔ | امدادی کتابوں کی فہرست | 137 |
| ۴۔ | خود آزمائی | 138 |

# یونٹ کے مقاصد

عزیز طلبا اور طالبات

ان دو یونٹوں کے موضوعات حقیقت نگاری' فطرت نگاری اور شعور کی رو ہیں۔ اردو ادب میں یہ تینوں چیزیں مغربی ادب سے آئی ہیں۔ یہ اصطلاحات مندرجہ ذیل انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ ہیں۔

(1) Realism (2) Naturalism

(3) Stream of Consiousness

ان یونٹوں کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مغربی فکشن (ناول اور افسانہ) میں یہ اصطلاحات جن معنوں میں استعمال ہوتی ہیں' ان سے واقفیت حاصل کرنا۔

۲۔ ان اصطلاحات کے تاریخی پس منظر سے واقف ہونا۔

۳۔ اردو ادب میں ان تینوں کے اثرات کو سمجھنا اور پہچاننا۔

## ۱۔ حقیقت نگاری اور فطرت نگاری

حقیقت نگاری' فطرت نگاری اور شعور کی رو ان تینوں چیزوں کا تعلق فکشن (ناول' افسانہ اور ڈراما) سے ہے۔ حقیقت نگاری اور فطرت نگاری فکشن کے بارے میں دو تنقیدی نظریے ہیں جبکہ شعور کی رو ایک مخصوص تکنیک ہے۔

حقیقت نگاری کے معنی ادب یا فکشن میں حقائق کو اسی طرح پیش کرنے کے ہیں جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہوتے ہیں خواہ وہ حقائق ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہوں۔

حقیقت نگاری کے بانی انیسویں صدی کے عظیم فرانسیسی ناول نگار فلابیر (۱۸۲۱_۱۸۸۱) کو مانا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگرچہ فلابیر کو حقیقت نگاروں کے اسکول سے نفرت تھی لیکن اس کے شہرہ آفاق ناول ''مادام بواری'' کی اشاعت (۱۸۵۷) کے بعد فرانس میں فلابیر کو حقیقت نگاری کا خاص مفسر تسلیم کیا جانے لگا۔ عہد حاضر کے ممتاز امریکی نقاد رینے ویلیک نے کہا ہے کہ حقیقت نگاری کی طرف فلابیر کا ردعمل انتہائی مبہم تھا۔

فلابیر نے کہا تا کہ مجھے حقیقی چیزوں کا عاشق سمجھا جاتا ہے جبکہ میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ میں نے ''مادام بواری'' حقیقت نگاری سے نفرت کی بنا پر لکھنا شروع کیا۔

فطرت نگاری کا آغاز بھی انیسویں صدی کے فرانس میں ہوا اس کی ابتدا ۱۸۶۸ء میں فلابیر کے ہم عصر ایملی ژولا (۱۸۴۰_۱۹۰۲) کے ایک ناول کی اشاعت سے ہوئی ژولا نے اس ناول کے دوسرے ایڈیشن میں پہلی مرتبہ لفظ فطرت نگاری استعمال کیا لیکن خود ژولا فرانس کے عظیم ناول نگار بالزاک (۱۷۹۹_۱۸۵۰) اور استاں دال (۱۷۸۳_۱۸۴۲) کو ناول میں فطرت نگاری کا پیشرو مانتا تھا۔ ایک جگہ اس نے بالزاک کو فطرت نگاری کا بابا آدم بھی قرار دیا ہے۔

فطرت نگاری فکشن میں انسان کے موروثی اثرات اور ماحول کے اثرات کا مطالعہ کرتی ہے۔

انگلینڈ میں حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کے نمائندے ہنری جیمس (۱۸۴۳_۱۹۱۶) اور جارج مور (۱۸۵۲_۱۹۳۳) تھے انگلینڈ میں ناول لکھنے کا نیا تصور انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے میں رواج پانے لگا اس نئے تصور کا رواج انیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں عظیم وکٹورین ناول نگار۔ ڈکنس، جارج ایلیٹ، ٹھیکرے وغیرہ کے خلاف ردعمل کا نتیجہ تھا۔ وکٹورین عہد کے ناول نگاروں کے ہاں فکشن کا اصلاحی تصور رواج پا گیا تھا۔

فطرت نگاری حقیقت نگاری سے ایک درجہ آگے کی چیز ہے۔ دراصل فطرت نگاری حقیقت نگاری ہی کی توسیع ہے بعض اوقات دونوں میں فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی فطرت نگاری کو سخت تر حقیقت نگاری بھی کہا گیا ہے۔

فطرت نگاروں کا خیال تھا کہ حقیقت نگار زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش نہیں کرتے۔ اس لیے فطرت نگاروں کی کوشش یہ تھی کہ زندگی سے متعلق ہر بات پیش کی جائے۔

حقیقت نگاروں پر فطرت نگاروں کا ایک الزام یہ رہا ہے کہ حقیقت نگار انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کی عکاسی میں ناکام رہے ہیں جو ناخوشگوار بدصورت اور مذموم ہیں نتیجتاً فطرت نگاری نے اپنی توجہ ان پہلوؤں پر مرکوز رکھی جن کی اخلاقی اہمیت مشکوک یا معدوم ہے۔ عام طور پر فطرت نگار انسانی فطرت کے اعلیٰ پہلوؤں کی مصوری نہیں کرتے۔

نظریاتی اعتبار سے فطرت نگاروں نے انسان کو ایسی قوتوں میں محصور دیکھا جن پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان ایک مخالف کائنات میں زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے لیے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر وہ بچنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنی اس کوشش میں وہ جانوروں کی سطح پر آ جاتا ہے۔ عام طور پر فطرت نگاری کے فلسفے میں یاسیت اور جبر کے پہلو پائے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر قابو پانے کی طاقت سے یکسر محروم ہے۔

انسان کے بارے میں اس فلسفیانہ تصور کا نتیجہ یہ نکلا کہ فطرت نگاروں کے ہاں انسان کسی نہ کسی قسم کے حالات کی قید میں گرفتار نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں انسان کا غالب تصور حیوان کا ہے فطرت نگار انسان کو اس لیے حیوان سے تشبیہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی اندرونی خواہشات پر قابو نہیں پا سکتا اور آخر کار حیوانیت کی سطح پر اتر آتا ہے فرانسیسی ناول نگار ژولا اور امریکی ناول نگار فرینک نورس

(۱۸۷۰_۱۹۰۲)انسان میں شرافت نفس کی کمی ظاہر کرنے کے سلسلے میں حیوان کی تصویر استعمال کرنے کے لیے مشہور ہیں۔

زندگی کی سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش میں فطرت نگار ایسی جسمانی چیزوں کو بیان کر جاتے ہیں جن کی تاب لانا قاری کے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔حقیقت نگار جانتے ہیں کہ زندگی کے ذلیل پہلو بھی ہوتے ہین لیکن وہ اکثر زندگی کے خوشگوار اور خوشنما پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے برعکس فطرت نگار زندگی کے بدصورت اور ناخوشگوار پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کر کے حقیقی زندگی کو بدشکل بنا دیتے ہیں۔

حقیقی زندگی کی آئینہ داری کے لیے اس کے برے اور بدصورت پہلوؤں پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اس کے اچھے پہلو نظر انداز ہو گئے اور زندگی صرف ایک بدصورت اور ناخوشگوار حقیقت بن کر رہ گئی فطرت نگاروں کے ہاں حقیقی زندگی کی مصوری کرنے اور انسانی زندگی کو مسخ کرنے میں فرق باقی نہیں رہا۔فرانسیسی ناول نگار اور افسانہ نگار ژولا اور موپساں (۱۸۵۰_۱۸۹۳) کے ناولوں اور افسانوں سے اسی قسم کا تاثر ملتا ہے۔

فطرت نگاری اپنی پیدائش کے وقت سے نقادوں کی نفرت کا مرکز رہی ہے۔بہتوں نے اس کی موت کا بھی اعلان کیا ہے لیکن دور حاضر کے امریکی نقاد ڈونلڈ پیزر (Donald Pizer) کا خیال ہے کہ فطرت نگاری امریکی فکشن کے نہایت ثابت قدم اور اہم عناصر میں سے ہے بلکہ شاید امریکہ میں واحد جدید ادبی ہیئت ہے جو بیک وقت مقبول بھی رہی ہے اور وقیع بھی۔

پیزر نے فطرت نگاری کی تعریف (Define) کرنے اور بیسویں صدی کے دوران امریکی فکشن پر اس کی مضبوط گرفت کی توجیہ کرنے کے لیے امریکہ کے چھ ناولوں کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔وہ ناول نگار یہ ہیں۔

1- Stud's Loingan by James T Farrell.

2- U.S. A, by John Dos Passos

3- The grapes of Wrath by John Steinbeck

4- The Naked and the Dead by Norman Mailer

5- Lie Down in Darkness by william Styron

6- The Adventures of Augie March by Saul Bellow.

پیزر کہتا ہے کہ فطرت نگاری پر اعتراض اس لیے ہوتا ہے کہ فطرت نگاری کے موضوع گھٹیا اور سنسنی خیز ہوتا ہے۔یہ انسان کی فطری اخلاقی حس اور اس کے عقیدے پر اعتراض کرتی ہے اور وہ اس قدر سماجی دستاویزات سے پر ہوتی ہے کہ فطرت نگاری پر مبنی ناول کو زندگی یا کسی عہد کا فوٹو گرافک ریکارڈ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے اور اس کی جمالیاتی قدر و قیمت کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پیزر انیسویں صدی کے نویں عشرے اور بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے لے کر پانچویں عشرے تک کے عہد کو امریکہ میں فطرت نگاری کے فروغ کا عہد قرار دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انیسویں صدی کے نویں عشرے میں ناول نگاروں (اشارہ ہے تھیوڈور ڈریزر اور فرینک نورس کی طرف) نے انسان کو سخت مجبور کی حیثیت سے دیکھا۔ انسان تجربے سے گزرتا تھا لیکن اس سے کچھ سیکھ نہیں پاتا تھا۔ ان ناول نگاروں نے انسان کو مفاہمت کا جویا محسوس کیا اور انھیں اس کی یہ جستجو (جستجوئے مفاہمت) بجائے خود قابل قدر معلوم ہوئی۔

انیسویں صدی کے نویں عشرے کے دوران فطرت نگاری پر مبنی ناولوں میں المیہ کا وہ تصور نہیں ملتا جو ارسطو نے پیش کیا ہے یعنی انسان کا کسی بلند مقام سے گرنا۔ فطرت نگاروں کے نزدیک ہر انسان کا مقدر یہ تھا کہ وہ اپنے امکانات کو حاصل نہ کر سکے اور یہی اس کا المیہ تھا۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں فطرت نگاری پر مارکس (جرمنی کا فلسفی) اور فرائڈ کا گہرا اثر تھا۔ مارکس کے اثر کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی اہمیت لے دے کر اتنی ہے کہ وہ سماجی ارتقاء کا ایک جزو ہے اور فرائڈ کے اثر کے معنی یہ ہے کہ انسان زیادہ تر اپنے لاشعور کے زیر اثر رہتا ہے۔ غرضیکہ زندگی انفرادی آزادی، نشو ونما اور مسرت پر المناک پابندیاں عائد کرتی ہے۔

بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے میں نقادوں نے فطرت نگاری کی موت کا اعلان کر دیا لیکن یہ اعلان قبل از وقت تھا بہت سے امریکی دانش وروں نے دیکھا کہ انفرادی تجربہ قدر کا واحد سرچشمہ ہے یہ ایک صدائے بازگشت تھی انیسویں صدی کے نویں عشرے اور بیسویں صدی کے فرانسیسی ''وجودیت'' کی ''وجودیت'' پر آپ دو الگ یونٹ اسی کورس میں پڑھیں گے۔

یہ ناول نگار اور وجودی فلسفے کے ماننے والے ہر قسم کے نظام اور ہر قسم کے قواعد وضوابط سے منحرف تھے۔ چوتھے اور پانچویں عشرے کے میلر اسٹائر واور بیلو اور تیسرے عشرے کے فیریل، ڈوس پیسوس اور اسٹین بیک میں ایک خصوصیت مشترک تھی۔ یہ سب لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا عہد انھیں آزادی سے محروم کرنے کے درپے ہے۔ فیریل ڈوس پیسوس اور اسٹین بیک نے امریکہ کی عظیم کساد بازاری دیکھی تھی بیلو، میلر اور اسٹائرون نے نیست ونابود کر دینے والے کیمپ، ایٹم بم، یورپ میں سرد جنگ، کوریا میں گرم جنگ اور میکارتھی کہ جادوگر کی تلاش (امریکہ میں جنرل میکارتھی کے اثر اشتراکیت پسند لوگوں کی تلاش اور تطہیر شروع ہو گئی تھی) دیکھی تھی۔

ڈولنڈ پیزر نے اپنی کتاب Twentienth Century American Literary Naturalism (بیسویں صدی میں امریکی ادبی فطرت نگاری) اس پس منظر میں لکھی ہے۔ ابھی اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔ اس کتاب میں پیزر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فطرت نگاری ابھی تک ایک زندہ تحریک یا روایت ہے۔ اس کے زندہ رہنے میں غالباً اس بات کو بھی دخل ہے کہ فطرت نگاری کائنات میں انسان کی جس بے بسی اور مجبوری کی ترجمان ہے وہ آج بھی ایک حقیقت ہے جس بے بسی اور

مجبوری کی ترجمان ہے وہ آج بھی ایک حقیقت ہے انسان ہر دور میں جبر کا شکار رہا ہے اس کی اصل حیثیت حالات کے قیدی کی رہی ہے۔تاریخی عوامل کے ہاتھوں خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں لیکن اس تبدیلی سے انسان کے قیدی ہونے میں فرق نہیں آتا۔بہرحال سول بیلو جیسے امریکی فطرت نگار انسان کے مستقبل سے بالکل مایوس بھی نہیں ہیں۔

اردو ادب پر فطرت نگاری سے زیادہ حقیقت نگاری کا اثر رہا ہے۔سرسید کے ساتھ اردو ادب میں جہاں اور بہت کچھ آیا وہاں حقیقت نگاری بھی آئی۔ان سے پہلے اردو ادب میں تخیل کی کارفرمائی زیادہ تھی جس کا ایک نتیجہ ہر چیز کے مبالغہ آمیز بیان کی شکل میں موجود تھا۔داستانیں تو خیز تحیر انگیزی ہی کے لیے لکھی جاتی تھیں لہذا ان میں مبالغہ آرائی کی کوئی انتہا نہ تھی شاعری میں قصائد حقیقت سے بالکل دور ہوتے تھے اور غزلیں مضحکہ خیز مبالغوں سے خالی نہ تھیں۔اٹھارھویں صدی میں نظیر اکبرآبادی حقیقت نگاری کی ایک مستثنیٰ مثال نظر آتے ہیں انیسویں صدی میں پہلے پہل سرسید اور ان کے رفقا نے اردو ادب اور اردو شاعری کو سچ بولنا سکھایا۔ان کی یہ قائم کردہ روایت اقبال اور پریم چند سے ہوتی ہوئی آج کے دور تک پہنچی ہے ہمارے ادیبوں' شاعروں' ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی کوشش یہ رہی ہے کہ زندگی کی سچی تصویریں پیش کی جائیں۔

اردو ادب میں نہ تو فطرت نگاری کی کوئی باقاعدہ تحریک چلی اور نہ فطرت نگاری کے بنیادی مفروضات ونظریات کو سامنے رکھ کر ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی۔تاہم اردو ادب میں کہیں کہیں فطرت نگاری کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے خصوصا ایسے اردو فکشن میں جہاں صرف بدی کو موضوع بنایا گیا ہے اور زندگی کے بعض معاملات میں عریاں نگاری سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے مثلا عصمت چغتائی' سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی جیسے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے ہاں زندگی کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ اپنی صداقت کے اعتبار سے حقیقت نگاری کی بجائے فطرت نگاری کے خانے میں رکھی جا سکتی ہیں۔

حقیقت نگاری کو سمجھنے کے لیے امدادی کتب

۱۔ مادام بواری (اردو ترجمہ پڑھیں) از فلابیر

۲۔ بڈھا گوریو (اردو ترجمہ پڑھیں) از بالزاک

۳۔ سرخ وسیاہ (اردو ترجمہ پڑھیں) از استاں دال

۴۔ منشی پریم چند کے افسانے

۵۔ ٹیڑھی لکیر (ناول) از عصمت چغتائی

۶۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے

فطرت نگاری کو سمجھنے کیلیے امدادی کتب

۱۔ موپساں کے افسانے
(جو کسی ایک کتاب کی شکل میں نہیں ہیں مگر اس کے بہت سے
افسانوں کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں)

۲۔ عصمت چغتائی کے افسانوں کے ابتدائی مجموعے مثلاً کلیاں

۳۔ منٹو کے افسانوں کے تمام مجموعے

۴۔ علی پور کا ایلی (ناول) از ممتاز مفتی

## ۲۔ شعور کی رو

بیسویں صدی کی ذھنی تشکیل میں جہاں کئی سائنسی نظریات کا ہاتھ ہے وہاں جرمنی کے فلسفی کارل مارکس (۱۸۱۸۔۱۸۸۳) اور آسٹریا کے ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶۔۱۹۳۹) کے اثرات کو بھی بے انتہا دخل ہے دونوں کے نظریات نے انسانی فکر و نظر میں زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے جہاں ایک طرف انسان کے سماجی اور سیاسی شعور کو مارکس نے بے حد متاثر کیا ہے وہاں دوسری طرف انسان کی داخلی اور نفسیاتی زندگی کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں فرائڈ سے بڑی مدد ملی ہے فرائڈ اور اس کا شاگرد ینگ (۱۸۷۵۔۱۹۶۱) دونوں جدید نفسیات کے بانیوں میں سے ہیں۔ دونوں کے نفسیاتی نظریات عہد حاضر کی ہر زبان کے شعر و ادب پر بہت اثر انداز ہوئے ہیں غالباً فرائڈ کے اثرات ینگ سے زیادہ ہیں۔ یہ فرائڈ ہی کے اثرات تھے جنہوں نے ڈاڈاازم اور سرریلزم جیسی شعری تحریکات کو جنم دیا۔ مغرب کے جدید ناول میں انسانی شخصیت کے اندرونی پہلوؤں کی عکاسی کے لیے اندرونی خود کلامی یا شعور کی رو کی تکنیک ایجاد کی گئی۔ اسے بھی ادب پر فرائڈ ہی کا اثر کہا جا سکتا ہے۔

فرائڈ کی نفسیات جہاں ہمیں بہت سی باتیں بتاتی ہے وہاں دو باتیں یہ بھی ہیں کہ انسان کے افکار واعمال پر اس کی شعور سے زیادہ گرفت لاشعور کی ہے اور یہ کہ انسان کی پوشیدہ ذہنی زندگی غیر مرتب اور غیر مربوط ہے انسان کے اندر کی اسی بے ترتیبی اور انتشار کو ظاہر کرنے کے لیے ناول میں اندرونی خود کلامی یا شعور کی رو سے کام لیا گیا۔

ڈورتھی رچرڈسن (۱۸۷۳۔۱۹۵۷) انگریزی ادب کی پہلی ناول نگار ہے جس نے اپنے ناول (۱۹۱۵) میں شعور کی رو کی تکنیک سے کام لیا۔ اس کے بعد اس کی ہم عصر ناول نگار ورجینا ولف (۱۸۸۲۔۱۹۴۱) نے اپنے ناولوں میں اس تکنیک کو بہتر طریقے سے استعمال کیا اور رچرڈسن کے دوسرے ہم عصر ناول نگار جیمس جوائس (۱۸۸۲۔۱۹۴۱) نے تکنیک کو اس نقطہ کمال پر پہنچا دیا جہاں

سے اس کو آگے لے جانا ممکن نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ جوائس کے بعد بیسویں صدی کے ایک اور عظیم ناول نگار ولیم فاکنر (۱۸۹۷۔۱۹۶۲) نے بھی اس تکنیک کو بڑے فن کارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔

جدید مغربی ناول کے نقادوں میں اس بات پر شدید اختلاف رہا ہے کہ اندرونی خودکلامی (Interior Monologue) اور شعور کی رو (Stream of Consciousness) ہم معنی اصطلاحات ہیں یا مختلف المعنی اصطلاحات۔

ورجینا ولف کا ایک نقاد جیمس نیری مور (James Naremore) کہتا ہے کہ روبرٹ ہمفری، میلون فریڈمین، فریڈرک ہوف مان اور روین بوتھ جیسے نقاد اشارتاً کہتے ہیں کہ شعور کی رو ایک ادبی صنف ہے جس کی تکنیکوں میں سے ایک تکنیک اندرونی خودکلامی بھی ہے۔ نیری مور کا خیال ہے کہ یہ تصور عام طور پر قبول کیا جا رہا ہے۔

لارنس باؤلنگ اور ارون اسٹین برگ کی رائے ہے کہ شعور کی رو ایک کم یاب تکنیک ہے جو اندرونی خودکلامی سے مختلف ہے اور یہ کہ ان دونوں اصطلاحوں کی بالکل صحیح تعریف ممکن ہے انگریزی ادب میں ان دونوں اصطلاحات کے نازک فرق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اس موضوع پر اردو میں شاید ایک مقالہ بھی موجود نہیں لیکن انگریزی میں اہم مقالے ہی نہیں کئی اہم کتابیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً

1- What is the stream of Consciousness Technioue?
by L.E. Bowling

2- Modes of Interior Monologue : A Formal Definition
by Dered Bickertion

3- Some Problems of Terminology in the Analysis of the Stream of Consiousness Novel
by Keith Leopold

4- Stream of Consciousness in the Modern Novel
by Robert Humphrey

5- Stream of Consciousness A Study in Literary Method
by Melvin Friedman

6- Rhetoric of Fiction by Wayne Booth

7- The Psychological Novel 1900-1950 by Leon Edel.

ان کتابوں میں خرابی صرف یہ ہے کہ پاکستان میں یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں ورجینا ولف کا ایک بہترین نقاد کہتا ہے کہ و رجینا ولف نے شعور کی رو والے ناول کبھی نہیں لکھے۔ والٹر الن جیسا ناول کا ممتاز مورخ اور نقاد اس خیال سے متفق نظر آتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شعور کی رو کی تعریفیں کتنی مختلف ہیں ایک تعریف کی رو سے ورجینا ولف اس تکنیک کی نمائندہ ناول نگار ہے اور دوسری تعریف کی رو سے اس نے شعور کی رو والے ناول لکھے ہی نہیں۔

شعور کی رو کی اصطلاح سب سے پہلے امریکی فلسفی ولیم جیمس (۱۸۴۲۔۱۹۱۰) نے اپنی مشہور کتاب ''اصول نفسیات'' میں استعمال کی۔ نیری مور کہتا ہے کہ اس نے ''خیال کا سلسلہ'' کو اس لیے مسترد کیا کہ اس میں ایک منطقی تسلسل کا مفہوم پایا جاتا ہے جیمس اپنے آپ سے انسانی ذہن کی گفتگو کے سیال اور مربوط پہلوؤں پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے اس کی یہ اصطلاح (شعور کی رو) بیک وقت ایک موضوع بھی ہے اور ایک اسلوب بھی۔ جیمس کی یہ اصطلاح اور فرانسیسی اصطلاح اندرونی خود کلامی متبادل مفہوم میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔

جیمس جوائس نے فرانسیسی ناول نگار کو اندرونی خود کلامی کا موجد قرار دیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بعض تکنیکیں جو یولیس (جوائس کا مشہور ناول) میں استعمال ہوئی ہیں ڈوجارڈن ہی کی دین ہیں۔

نیری مور نے کہا کہ ڈوجارڈن نے اندرونی خود کلامی کی جو تعریف کی ہے وہ غیر واضح ہے وہ تحریک اس کے اپنے عمل سے زیادہ جوائس کے عمل پر مبنی ہے۔

ڈوجارڈن اس اصطلاح کی تعریف یوں کرتا ہے کہ اندرونی خود کلامی ''کسی منظر میں ایک کردار کی گفتگو ہوتی ہے جس کا مقصد تشریح اور تبصرے کے ذریعے مصنف کی مداخلت کے بغیر ہمیں اس کردار کی اندرونی زندگی سے براہ راست متعارف کرانا ہے اس لحاظ سے اندرونی خود کلامی روایتی خود کلامی سے مختلف ہوتی ہے۔ اپنے انداز کے اعتبار سے اندرونی خود کلامی اس نہایت بے تکلف خیال کا اظہار ہے جو لاشعور سے قریب ترین ہے ہیئت کے اعتبار سے اندرونی خود کلامی براہ راست فقروں میں پیش کی جاتی ہے جس میں نحوی ترکیب و ترتیب کم سے کم ہوتی ہے۔''

اس تعریف میں نقادوں کے لیے جو چیز سب سے زیادہ الجھن کا باعث رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف ڈوجارڈن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اندرونی خود کلامی کی تکنیک ایک کردار کی گفتگو کی ترجمانی کرتی ہے دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ یہ تکنیک لاشعور سے قریب ترین گہرے خیال کا اظہار کرتی ہے بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ لاشعور سے قریب ترین بے تکلف خیالات گفتگو کے ذریعے ظاہر نہیں کیے جاتے اس لحاظ سے ڈوجارڈن کی تعریف میں انھیں تضاد اور تناقص نظر آتا ہے۔

لارنس باؤلنگ کا خیال ہے کہ اندرونی خود کلامی اور شعور کی رو دو ایسی چیزوں کی نمائندگی کرتی ہیں جو ایک دوسرے سے

زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

باؤلنگ نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ شعور کی رو اور اندرونی خود کلامی کو اندرونی تجزیے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اندرونی تجزیے میں مصنف دخیل ہوتا ہے اور وہ قاری اور کردار کے درمیان مترجم کا فرض ادا کرتا ہے۔ ڈورتھی رچرڈسن اور ورجینا ولف کا طریق کار یہی رہا ہے اور یہ طریق کار بنیادی طور پر شعور کی رو سے مختلف ہے۔

شعور کی رو اور اندرونی خود کلامی انسانی ذہن کا براہ راست اقتباس پیش کرتی ہیں۔

باؤلنگ نے شعور کی رو اور اندرونی خود کلامی کی جو تعریفیں کی ہیں ان کے اعتبار سے ادب کے بیشتر حصے پر ان اصطلاحات کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ ڈوجارڈن کے طریق کار کو بھی اندرونی تجزیے پر محمول کرتا ہے۔

روبرٹ ہمفری کا کہنا ہے کہ چونکہ جوائس، ولف، رچرڈسن اور فاکنر شعور کی رو کے ناول نگار کہلاتے ہیں اس لیے شعور کی رو کی جو الجھی ہوئی بحث ڈوجارڈن کے ہاں ملتی ہے اسے چھوڑ کر اس اصطلاح کی ایک ایسی نئی تعریف مقرر کرنا پڑے گی جو ان ناول نگاروں کی قدر مشترک پر مبنی ہو۔

ہمفرک کی رائے میں شعور کی رو طریق کار کم اور نفس مضمون زیادہ ہے اس کے نزدیک شعور کی رو نفسیاتی فکشن کی ایک قسم ہے جو دوسرے نفسیاتی ادب سے مختلف ہے۔ مثلاً ہنری جیمس (۱۸۴۳۔۱۹۱۶) اور مارسل پروست (۱۸۷۱۔۱۹۲۲) کے ناولوں سے۔

ایتھونی برگس نے اپنی تصنیف ''انگریزی ادب'' میں ورجینیا ولف کے متعلق لکھا ہے کہ ''جوائس کی طرح وہ اپنے کرداروں کے شعور کی رو کی مصوری اندرونی خود کلامی کے ذریعے کرتی ہے''۔

اس جملے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعور کی رو خود کوئی تکنیک نہیں بلکہ ایک موضوع ہے جس کا اظہار اندرونی خود کلامی کے ذریعے ہوتا ہے۔

جدید مغربی ناول کے نقادوں نے شعور کی رو اور اندرونی خود کلامی کے معاملے میں بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ ان دونوں کو دو مختلف چیزیں قرار دیتے ہوئے انھوں نے ان دونوں کو ''اندرونی تجزیے'' سے بھی مختلف سمجھنے کی ہدایت کی ہے لیکن عام طور پر شعور کی رو اور اندرونی خود کلامی مترادف اصطلاحات سمجھی جاتی ہیں۔

اردو ادب میں شعور کی رو یا اندرونی خود کلامی کا استعمال بہت کم ہوا ہے حسن عسکری کے بعض افسانوں مثلاً (چائے کی پیالی، حرامجادی، قیامت ہر کاب آئے نہ آئے) اور قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کے سوا اس کا استعمال کہیں اور نہیں ہوا۔ جہاں تک انگریزی ادب کا تعلق ہے ڈوروتھی رچرڈسن ورجینا ولف اور جیمس جوائس کے مندرجہ ذیل ناولوں کا مطالعہ مفید طلب ہوگا۔

1- Pointed Roofs by Dorothy Richardson

2- The Waves by Virginia Woolf

3- Ulysses by James Joyce

## ۳۔ امدادی کتابوں کی فہرست

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | مادام بواری | ازفلوبیر اردو ترجمہ |
| ۲۔ | بڈھا گوریو | ازبالزاک اردو ترجمہ |
| ۳۔ | سرخ وسیاہ | ازاستاں دال اردو ترجمہ |
| ۴۔ | منشی پریم چند کے افسانے | (جہاں تک دستیاب ہوں) |
| ۵۔ | ٹیڑھی لکیر (ناول) | ازعصمت چغتائی |
| ۶۔ | راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعے | |
| ۷۔ | موپساں کے افسانے | جو اردو میں دستیاب ہوں۔ |
| ۸۔ | کلیاں | ازعصمت چغتائی |
| ۹۔ | منٹو کے افسانوی مجموعے | (جہاں تک دستیاب ہوں) |
| ۱۰۔ | علی پور کا ایلی (ناول) | ازممتاز مفتی |
| ۱۱۔ | جزیرے | ازحسن عسکری |
| ۱۲۔ | آگ کا دریا | ازقرۃ العین حیدر |
| ۱۳۔ | جھلکیاں (حصہ اول) | ازمحمد حسن عسکری |

## ۴۔ خودآزمائی

۱۔ حقیقت نگاری، فطرت نگاری اور شعور کی رو کا باہمی فرق کیا ہے؟

۲۔ کیا حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کی تحریکات اور شعور کی رو کی تکنیک یہ تینوں چیزیں فرانس میں پیدا ہوئیں؟ ان کے بانیوں کے نام بتائیں؟

۳۔ حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کے فرق پر بحث کیجئے؟

۴۔ فطرت نگاری میں انسان کا تصور کیا ہے؟

۵۔ فطرت نگاری انسانی زندگی کے کن پہلوؤں کی ترجمانی پر زور دیتی ہے۔

۶۔ کیا فطرت نگاری حقیقت نگاری کے منافی ہے؟

۷۔ شعور کی رو کی اصطلاح کا بانی کون تھا اور اس نے اس اصطلاح کو کس دوسری اصطلاح پر ترجیح دی تھی؟

۸۔ کیا ''اندرونی خودکلامی'' اور ''شعور کی رو'' ایک ہی تکنیک کے دو نام ہیں؟

۹۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''شعور کی رو'' ایک موضوع ہے اور ''اندرونی خودکلامی'' اس کے اظہار کا ایک ذریعہ یا تکنیک ہے؟

۱۰۔ اردو ادب میں ''شعور کی رو'' کی تکنیک کس نے استعمال کی ہے اور کس ناول میں استعمال کی ہے؟

یونٹ ۱۷۔۱۸

# وجودیت ___ فلسفے اور ادب میں

تحریر: نظیر صدیقی

# فہرست مندرجات


| نمبر شمار | عنوان | صفحات |
|---|---|---|
| | یونٹ کے مقاصد | 141 |
| ۱۔ | وجودیت ۔ فلسفے میں | 141 |
| ۲۔ | وجودیت ۔ ادب میں | 150 |
| ۳۔ | مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست | 155 |
| ۴۔ | خود آزمائی | 157 |

# یونٹ کے مقاصد

عزیز طلبا وطالبات:

مطالعاتی رہنما کے ان دو یونٹوں کا موضوع ''وجودیت'' ہے جو عہد حاضر کا ایک نہایت مقبول فلسفہ بھی ہے اور ایک زبردست ادبی اثر بھی۔ ان یونٹوں کے مطالعے کے بعد آپ یہ جان سکیں گے کہ:

۱۔ وجودیت کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اس فلسفے کے نمائندہ مفکرین کون لوگ ہیں؟ وہ ایک دوسرے سے کس حد تک مماثل اور مختلف ہیں۔ ان کے بنیادی خیالات وجودیت کے مرکزی تصورات اور اس کی مخصوص اصطلاحات کیا ہیں؟

۲۔ وجودیت عہد حاضر کے ادب پر کیوں اثر انداز ہوئی ہے اور کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے؟ اردو ادب پر اس کے اثر کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ وجودیت کو سمجھنے کے لیے کن اردو تحریروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

## ۱۔ وجودیت ۔ فلسفے میں

مشرقی ادب پر جس حد تک تصوف کا نظریہ ''وحدت الوجود'' اثر انداز ہوا ہے شاید اسی حد تک مغربی ادب پر فلسفے کا نظریہ ''وجودیت'' اثر انداز ہے لیکن وجودیت کا اثر صرف ادب تک محدود نہیں۔ اس کے اثرات مذہب، سیاست اور نفسیاتی طب (سائکے ایٹری) میں بھی واضح ہیں۔

وجودیت کے وسیع اثرات کے باوجود انگلستان کے فلسفیوں نے اس فلسفے کو اہمیت نہیں دی۔ برٹرینڈ رسل نے تو اس کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ یورپ کا وجودی فلسفہ بعض اعتبار سے ایک الجھانے والا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جسے روایتی معنوں میں فلسفہ کہا جا سکے۔

رسل نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ فرانس میں ''وجودی'' تحریک کا ادب کے ساتھ بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ دراصل وجودیت جو دوسری جنگ عظیم کے دوران (۱۹۳۹۔۱۹۴۵) یورپ کا سب سے اہم فلسفہ بنی دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے تقریباً تمام ادب پر اثر انداز ہوئی امریکی ادب پر اس کا اثر فرانسیسی ادب سے بھی زیادہ نظر آتا ہے۔

وجودیت کو سرے سے فلسفہ نہ ماننا یا اسے خود فلسفے کے خلاف ایک فلسفیانہ تحریک قرار دینا ایک اہم تبصرہ ضرور ہے لیکن جب ہم اس کے نشو ونما پر غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وجودیت مغربی فلسفے کے ارتقا کی ایک فطری شاخ ہے اور یہ مغربی نظام فکر سے گہرے

طور پر مربوط ہے۔

ادب کے طالب علموں کے لیے وجودیت کی فلسفیانہ اساس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جتنا اس کے ادبی اثرات کو سمجھنا آسان ہے۔فلسفہ مشرقی ہو یا مغربی اس کے ایک حصے کو سمجھنے کے لیے اس کے باقی حصوں کو بلکہ پوری تاریخ کو جاننا ضروری ہے۔

وجودیت کی تشریح و تعبیر پر بے شمار مقالوں کے علاوہ بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔مغربی فلسفے کی کوئی بھی موجودہ تاریخ اس کے ذکر سے خالی نہیں۔پروفیسر ولیم ایس سہا کی یان نے اپنی تصنیف ''تاریخ فلسفہ'' میں 'وجودیت'' کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وجودیت (Existentialism) کی تحریک مظہریت (Phenomenology) کی تحریک سے نکلی ہے لیکن اس کا بنیادی فلسفہ ڈنمارک کے فلسفی سورین کیرکیگور (۱۸۱۳۔۱۸۵۵) کے خیالات سے ماخوذ ہے۔

مظہریت کے بنیادی نظریات کو سمجھنا آسان نہیں لیکن اتنا جاننے میں کوئی حرج بھی نہیں کہ مظہریت کے بنیادی نظریات جن فلسفیوں نے قائم کیے ان میں برمن عیو،ہسرل شیلر،ھارٹ مان اور مرلوپونٹی کے نام بہت نمایاں ہیں۔

مظہریت اور وجودیت کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ مظہریت جوہر (Essence) کو اولیت کا درجہ دیتی ہے جبکہ وجودیت وجود (Existence) کو۔وجودیت فلسفے کا ایک بنیادی نظریہ یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے یعنی Existence Preceds Essence برٹرینڈرسل نے اس نظریے کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ پہلے ہم یہ جانتے ہیں کہ ایک چیز ہے۔اس کے بعد ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ چیز کیا ہے پروفیسر سہا کی یان نے اسی بات کو یوں کہا ہے کہ آدمی جو طرز حیات اختیار کرتا ہے اس سے اس کا جوہر (یعنی فطرت) برآمد ہوتا ہے۔

کیرکے گور ایک پرجوش عیسائی تھا لیکن وہ دین اور الٰہیات کے معاملے میں عقل کا مخالف تھا۔اس لیے اسے اپنے ملک کے سرکاری چرچ سے متصادم ہونا پڑا۔اس نے عقیدے کو عقل سے بالکل الگ کر دیا۔اس کے نزدیک عقل کی اہمیت تھی ہی نہیں جبکہ اس کے معاصر فلسفی هیگل (۱۷۷۰۔۱۸۳۱) کے نزدیک عقل ہی سب کچھ تھی۔اس افراط و تفریط پر برٹرینڈرسل کا تبصرہ یہ ہے کہ عقل کی اہمیت کو گھٹانا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا اس کی اہمیت کو حد سے زیادہ بڑھانا۔عقل کے بارے میں هیگل کے خیالات نہایت بلند تھے اس لیے وہ یہ سوچنے کی غلطی کر بیٹھا کہ عقل کائنات کو جنم دے سکتی ہے کیرکے گور دوسری انتہا پر چلا گیا۔اس نے یہ سوچا کہ عقل خاص چیزوں کے سمجھنے میں ہماری مدد کرنے سے قاصر ہے اور خاص چیزیں ہی جاننے کے قابل ہیں۔اس طرح کا نقطۂ نظر سائنس کی تمام قدر و قیمت کا منکر ہوتا ہے اور رومانیت کے بہترین اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے۔جو اصول وجودی فکر کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہ رسل کے نزدیک ایک گڈمڈ قسم کے رومانی تصور سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ کیرکے گور جیسے مذہبی فلسفی کا اثر جس فلسفی کے ذریعے عام ہوا وہ ملحد فلسفی مارٹن هائڈ یگر

(۱۸۸۹_۱۹۷۵)تھا۔

بیسویں صدی میں وجودیت کے ممتاز ترین نمائندے یہ چار فلسفی مانے گئے۔ (۱) ھائیڈیگر (۲) گیب رل مارسل (۱۸۸۹) (۳) کارل یپسپر (۱۸۸۳_۱۹۶۹) اورژاں پال سارتر (۱۹۰۵_۱۹۸۰)ان میں دو فلسفی گیب رل مارسل اور کارل یپسپر عیسائی تھے اور دو فلسفی ھائیڈیگر اور سارتر ملحد۔

ان چاروں فلسفیوں کے مذہبی عقائد کی وجہ سے وجودیت کی دو قسمیں ہوگئیں۔ (۱) عیسائی یا مذہبی وجودیت اور (۲) ملحدانہ وجودیت ۔۔مارسل اور یپسپر عیسائی وجودی تھے اور ھائیڈیگر اور سارتر ملحد وجودی۔چونکہ ان چاروں میں سب سے زیادہ اثر سارتر کا رہا ہے اس لیے دنیا میں ملحدانہ وجودیت زیادہ متعارف اور مقبول رہی ہے۔

سارتر کے نزدیک وجودیت کے چند بنیادی عقیدے اور اصول (Tenets) یہ ہیں۔

(۱) وجود جوہر پر مقدم ہے۔اس کے دو معنی اوپر کی سطروں میں لکھے جا چکے ہیں۔تیسرے معنی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جو کچھ بناتا ہے اس کے سوا وہ کچھ اور نہیں ہوتا۔

(۲) اگر یہ صحیح ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے تو آدمی جو کچھ ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے اور جب یہ بات کہی جائے کہ آدمی اپنی ذات کے لیے ذمہ دار ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ صرف اپنی انفرادیت کا ذمہ دار ہے بلکہ وہ تمام آدمیوں کے لیے ذمہ دار ہے۔مثال کے طور پر اگر میں شادی کرتا ہوں تو صرف اپنے آپ کو یک زوجگی کا ذمہ دار نہیں بناتا بلکہ پوری دنیائے انسانیت کے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہوں۔

(۳) انسان کرب کے عالم میں ہے۔اس کرب کی نوعیت ان تمام لوگوں کو معلوم ہے جنھوں نے ذمہ داریاں اٹھائی ہیں۔ اگر وجود واقعی جوہر پر مقدم ہے تو انسان اپنے کسی عمل کی تشریح یا توجیہہ کسی دی ہوئی مخصوص انسانی فطرت کے حوالے سے نہیں کرسکتا۔بالفاظ دیگر انسان کسی چیز کا شکار نہیں۔انسان آزاد* ہے آزادی کا دوسرا نام انسان ہے۔انسان کی سزا یہی ہے کہ وہ آزاد ہے (Man is Condemned to Freedom) سزا ان معنوں میں کہ انسان نے اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا پھر بھی وہ آزاد ہے اور اس لمحے سے جب وہ اس کائنات میں پھینکا گیا (وجودیت انسان کی تخلیق کو اسی طرح بیان کرتی ہے کہ انسان اس کائنات میں پھینکا گیا) وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے۔وہ اپنا قانون ساز آپ ہے۔وہ اقدار کا خالق اور اپنی شخصی تکمیل کا اہل ہے۔

---

* روس کا عظیم ناول نگار دوستوفسکی (۱۸۲۱_۱۸۸۱) جو دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے اس نے اپنے عظیم ترین ناول ''ودی برادر کرامازوف'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انسان کی سب سے بڑی تشویش یہ ہوتی ہے کہ یہ بدنصیب مخلوق جس آزادی کے ساتھ پیدا ہوئی ہے وہ جلد سے جلد اسی کے حوالے کردے۔

(۴) وجودیت کے فلسفے کے ساتھ انسان کی بیچارگی (Adandonment) اور نا امیدی (Despair) کا تصور بھی وابستہ ہے بیچارگی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کے بارے میں خود فیصلہ کرتا ہے یا فیصلہ کرنے پر مجبور ہے۔ نا امیدی سے مراد یہ ہے کہ انسان کو کسی امید کے بغیر عمل کرنا چاہیے۔ ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ دنیا کی بجائے اپنے آپ کو فتح کرو۔ سارتر کے نزدیک اس قول کے معنی یہی ہیں کہ انسان کو امید کے بغیر عمل کرنا چاہیے۔

(۵) انسانی فطرت نام کی کوئی چیز نہیں ہے جسے میں بنیاد بنا سکوں۔ اس لیے میں نہ تو انسانی خیر پر اعتماد کی بنیاد رکھ سکتا ہوں نہ معاشرے کی فلاح سے انسانی دلچسپی پر بھروسہ کر سکتا ہوں میں جو کچھ دیکھ سکتا ہوں وہیں تک اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔ مجھے اس بات کا بھی بھروسا نہیں ہے کہ میرے رفقا میرے مرنے کے بعد میرے کام کو جاری رکھیں گے اور اسے درجہ کمال تک پہنچائیں گے کیونکہ وہ لوگ آزاد ہیں اور کل کو وہ آزادی کے ساتھ طے کریں گے کہ آدمی کو اس وقت کیا ہونا ہے۔
اس کے معنی یہ نہیں کہ مجھے کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مجھے کسی خوش گمانی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اور مجھے وہ کچھ کرنا چاہیے جو میں کر سکتا ہوں۔
مثلاً اگر میں اپنے آپ سے سوال کروں کہ کیا کوئی سماجی نصب العین کبھی ایک حقیقت بن سکتا ہے؟ تو میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ کسی سماجی نصب العین کو حقیقت بنانے کے لیے جو کچھ میرے اختیار میں ہوگا وہ میں کروں گا۔ اس کے آگے میں کسی چیز پر انحصار نہیں کر سکتا۔

(۶) توکل پرستی ان لوگوں کا رویہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ میں نہیں کر سکتا اسے دوسروں کو کرنے دو۔ وجودیت توکل پرستی کی بالکل ضد ہے وجودیت کے اعتبار سے آدمی کا وجود وہیں تک ہے جہاں تک وہ اپنے امکانات کو بروئے کار لاتا ہے بالفاظ دیگر ہر آدمی اپنے اعمال کا مجموعہ ہے یہ خیال ایک ایسے آدمی کے لیے تکلیف دہ ہوگا جس نے اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنایا ہے یہ خیال ہر آدمی کو یہ سمجھنے کے لائق بناتا ہے کہ صرف حقیقت قابل اعتبار ہے خواب توقعات اور امیدیں آدمی کی تعریف Definition منفی انداز میں کرتی ہیں نہ کہ مثبت انداز میں۔ ان باتوں سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے سلسلے کے سوا کچھ اور نہیں۔
غرضیکہ وجودیت توکل پرستی کا فلسفہ نہیں ہے کیونکہ اس میں انسان کی تعریف Definition اس کے عمل کے حوالے سے ہوتی ہے۔
وجودیت انسان کا یاسیت پرستانہ بیان نہیں ہے کیونکہ وجودیت سے زیادہ کوئی نظریہ امید پرستانہ نہیں ہے۔
وجودیت انسان کو عمل سے روکنے کی کوشش نہیں ہے۔ وجودیت انسان سے صرف یہ کہتی ہے کہ انسانی عمل کے سوا کہیں کوئی

امید نہیں ہے۔

(۷) وجودیت ان معنوں میں ملحدانہ نہیں ہے کہ وہ خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتی۔ دراصل اس کا اعلان یہ ہے کہ اگر خدا ہے بھی تو وجودی نقطہ نظر سے اس کے ہونے سے بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ خدا کے وجود کا نہیں۔ انسان کی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دریافت کرے اور یہ سمجھے کہ اسے اس کی ذات سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی یہاں تک کہ خدا کے وجود کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں۔

اس لحاظ سے وجودیت ایک رجائیت پرستانہ فلسفہ ہے یہ ایک نظریہ عمل ہے۔

جس طرح ھائیڈیگر کے اثر سے بیسویں صدی میں اصلی زندگی Authentic Life اور غیر اصلی زندگی (In-anthauntic Life) کے تصورات عام ہوئے اس طرح سارتر کے اثر سے ذاتی شرکت' ذمہ داری' فیصلہ سازی (Decision - making)' اور تعہد یعنی کسی مقصد یا نصب العین سے وابستگی (Commitment) کے الفاظ اور ان الفاظ سے متعلق تصورات عام ہوئے ہیں۔ خصوصاً Commitment کا لفظ تو بہت زیادہ استعمال میں آ گیا ہے ان سارے الفاظ یا اصطلاحات کے پیچھے وجودی تصورات کارفرما ہیں۔

کیرکے گور کی طرح جرمنی کا فلسفی نطشے (۱۸۴۴۔۱۹۰۰) بھی اپنے زمانے میں کوئی خاص اثر نہیں رکھتا تھا لیکن بیسویں صدی میں اس کے اثرات روزافزوں ہیں۔

نطشے نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''زرتشت نے کہا'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''خدا مر چکا ہے'' صرف اس فقرے کی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ جدید وجودیت ان الفاظ سے شروع ہوئی ہے۔ تین لفظوں کے اس فقرے کی بہت سی تشریحیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک تشریح یہ ہے کہ یہ فقرہ ایک ایسی دنیا کا اعلان کرتا ہے جو سماجی انتشار اور جنگ کی تباہی سے پیدا ہوئی ہے اور جس دنیا میں انسان بنیادی طور پر اکیلا ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ وہ آزاد ہے اس دنیا نے تمام روایتی اقدار اور سماجی رسوم کو مسترد کر دیا ہے اور وہ زندگی کو ایک ایسی چیز کی طرح دیکھتی ہے جیسے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی گہرائیوں سے پیدا کرے یہ دنیا زندگی کی بنیادی لایعنیت (وجودیت کے فلسفے میں زندگی کے بے معنی اور لایعنی ہونے کا تصور ایک مرکزی تصور ہے) اور تباہی کو قبول کرتے ہوئے امید کا ایک ایسا فلسفہ تجویز کرتی ہے جو ایک اصلی انسانی وجود کو حاصل کرنے کی جدوجہد پر مبنی ہے۔

وجودیت کا پہلا فلسفی کیرکے گور ایک باغی فلسفی تھا۔ اس نے فلسفہ اور سائنس دونوں سے بغاوت کی۔ اس کے نزدیک انسانی

صورت حال اتنی پیچیدہ ہے کہ وہ نہ فلسفے کی گرفت میں آ سکتی ہے نہ سائنس کی گرفت میں۔

نطشے نے انسان کو اپنی جد وجہد پر انحصار کرنا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا۔اس نے ان عام چیزوں پر یقین کرنے سے انکار کر دیا جو انسانی فطرت اور انسانی تجزیے سے بالاتر ہیں۔

ھس سرل کے فلسفہ مظاہر نے یہ بتایا کہ چیزوں کو شعور کے ظہور کے طور پر دیکھنا چاہیے کہ اس طرح انسانی وجود پر انسانی کنٹرول میں اضافہ کرنا چاہیئے۔فلسفہ مظاہر میں انسانی ارادے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

ھائیڈیگر نے اس بات کا احساس دلایا کہ انسان ایک عجیب وغریب غیر معتبر مخلوق ہے جس کا حقیقت سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

کارل یسپر کا خیال تھا کہ جینا جاننے کے منافی ہے اس لیے انسانی علم انسانی وجود کو کبھی سمجھ نہیں سکتا۔علم کی مختلف اقسام انسانی روح کے لیے قید خانوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گیب رل مارسل کے نزدیک انسانی زندگی مسئلہ نہیں معمہ ہے وہ عقیدے اور روحی کا قائل تھا۔

سارتر وجود کو جوہر پر مقدم مانتا ہے اور اس نظریے سے متعدد نتائج اخذ کرتا ہے۔

سارتر کا فرانسیسی معاصر البیر کامیو (۱۹۱۳۔۱۹۶۰) دنیا کو بنیادی طور پر نہ صرف لایعنی (Absured) تسلیم کرتا ہے بلکہ انسان کے معاملے میں بے نیاز اور مخالف بھی۔بہر حال اس نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں انسان کو تخریبی اور استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ کرنے کی تلقین کی۔

کولن ولسن (پیدائش ۱۹۳۱) انگلستان کا واحد ادیب ہے جس نے وجودیت کے فلسفے سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور ایک نئی وجودیت کے بانی ہونے کا دعویٰ کیا۔

کولن ولسن بنیادی طور پر ادیب اور نقاد ہے لیکن اس کی مرکزی دلچسپی ادب اور تنقید سے زیادہ انسانی تقدیر اور انسانی امکانات سے ہے۔اس نے کیر کے گور سے لے کر کامیو تک تمام وجودی فلسفیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان پر بہت سی نکتہ چینیاں کی ہیں۔چونکہ فلسفیوں کے برعکس اس کی تحریروں میں بڑی وضاحت اور دلکشی ہے اس لیے اس کی تحریروں کو سمجھنا آسان اور پڑھنا دلچسپ ہے۔

ایڈمنڈ' کیئر کے گور' نطشے ' گیبریل مارسل' کارل یسپر' ھس سرل' مارٹن ھائڈیگر' ژاں پال سارتر' آلبیر کامیو اور کولن ولسن کا تفصیلی مطالعہ وجودیت کی تاریخ کا مطالعہ ہے ویسے خیالات کی تاریخ کی لغت (جلد دوم) میں صرف کیر کے گور' ھائیڈیگر اور سارتر کو بڑا وجودی مفکر تسلیم کیا گیا ہے جبکہ کیر کے گور نے وجودیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔وہ اپنے آپ کو فلسفی بھی نہیں سمجھتا۔ھائیڈیگر

نے کہا ہے کہ اس کے فلسفیانہ میلانات کو وجودیت کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا اور سارتر نے اپنے آپ کو وجودی مفکر صرف اس لیے مانا کہ وہ اکثر وجودی مفکر کہا گیا اس لیے اس نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ اس لیبل کو قبول کر لے۔

وجودیت بنیادی طور پر داخلیت' آزادی اور عمل کا فلسفہ ہے یہ انیسویں صدی کی عقل پرستی اور سائنس پرستی دونوں سے بغاوت ہے وجودیت کے نزدیک صداقت داخلی ہے اور عقل اسے گرفت میں نہیں لے سکتی۔ وجودیت کا ایک بنیادی مسئلہ آزادی ہے۔ انسان آزاد ہے اسے آزاد رہنے کی سزا ملی ہے اس آزادی کی بنا پر اسے زندگی کی ہر صورت حال میں فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنی پڑتی ہے۔ وہ کسی بھی معاملے میں صرف اپنے لیے فیصلہ نہیں کرتا بلکہ ساری دنیائے انسانیت کے لیے فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن مسئلے کا حل صرف فیصلے پر منحصر نہیں۔ فیصلے کو عمل میں لانے کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ اس طرح وجودیت عمل کا فلسفہ بن جاتی ہے۔

## ۲۔ وجودیت ۔ ادب میں

وجودی ادب کی سب سے پہلی مثال روسی ناول نگار دوستوفسکی کا ناول ''نوٹس فرام انڈر گراؤنڈ'' Notes from (underground) ہے جسے وجودی ادب کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ دوستوفسکی نے ''وجودیت'' سے واقفیت کے بغیر ایسا ناول لکھا جو سارے وجودی ادب کا پیشرو ہے۔ جس طرح دوستوفسکی نہیں جانتا تھا کہ وہ ''نوٹس فرام انڈر گراؤنڈ'' کی شکل میں وجودی ادب لکھ رہا ہے۔ اسی طرح اس کا کم عمر معاصر نطشے بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی تصنیف ''زرتشت نے کہا'' میں بیک وقت وجودیت کا فلسفہ اور وجودیت کا ادب تخلیق کر رہا تھا دوستوفسکی کے ناول کے بعد نطشے کی یہ تصنیف وجودی ادب کا دوسرا شاہکار ہے ویسے نطشے کے وجودی افکار اس کی دوسری فلسفیانہ کتابوں میں بھی موجود ہے نطشے ایک غیر معمولی فلسفی ہونے کے علاوہ ایک غیر معمولی ادیب اور انشا پرداز بھی تھا وجودیت کے نمائندہ فلسفیوں میں مارسل نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے ہیں جو اس کے وجودی نقطہ نظر کے ترجمان ہیں لیکن سارتر نہ صرف زیادہ قد آور وجودی فلسفی ہے بلکہ زیادہ قد آور وجودی ادیب بھی۔ سارتر کے ناولوں ڈرامے اور افسانے وجودی ادب کے نہایت عمدہ شاہکار ہیں۔ اس کے ناولوں میں

(۱) The Diary of Antoine Requentin

(۲) The Age of Reason ڈراموں میں The Files اور افسانوں میں The Wall خاص طور پر مشہور ہیں۔ البیر کامیو کے تینوں مشہور ناول (۱) The Outsider (۲) The Plague (۳) The Fall وجودی ادب کے نمائندہ ناول ہیں۔ اسی طرح اس کے ڈرامے اور افسانے بھی وجودی ادب کی نہایت اچھی مثالیں ہیں۔

بیسویں صدی کے عظیم ناول نگاروں میں کافکا (۱۸۸۳۔۱۹۲۴) کے دو ناول

(۱) The Trial (۲) The Castle وجودی ادب کے اہم ترین ناولوں میں سے ہیں۔

کافکا کا ہم وطن (دونوں Prague کے باشندے تھے) اور ہم عصر شاعر ماریا رلکے (۱۸۷۵۔۱۹۲۶) بیسویں صدی کے تین چار عظیم ترین مغربی شعرا میں شمار ہوتا ہے امریکی فلسفی اور نقاد والٹر کوف مان نے اس کی شاعری کو بھی وجودی ادب میں شمار کیا ہے۔ وجودی ادب کا ایک سرسری جائزہ بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وجودی ادب نہایت مالدار ادب ہے۔ اس میں دنیا کے کئی عظیم شہکار موجود ہیں۔

یوں تو دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹۔۱۹۴۵) سے لے کر اب تک وجودیت دنیا کے ہر ترقی یافتہ ادب پر اثر انداز رہی ہے لیکن اب وجودیت فرانس اور جرمنی سے بھی زیادہ امریکہ کے ادب پر اثر انداز معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں امریکی ادب پر وجودیت کا اثر نمایاں رہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکہ براہ راست ملوث تھا۔ اس جنگ کی عالمگیر تباہی کا آخری منظر ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹم بم کا استعمال تھا۔ اس صورت حال نے امریکی ادیبوں میں سے بعض کے اندر تلخی اور قنوطیت پیدا کی اور بعض کے اندر زندگی کی لاحاصلی اور لایعنیت کے احساس کو جگایا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ قومی اور سماجی اہمیت کے موضوعات پر لکھنا ممکن نہیں رہا امریکی ناول نگار اور ڈراما نگار جوئس' کافکا' بیکٹ اور ژینے جیسے یورپی ناول نگاروں اور ڈراما نگاروں سے متاثر ہو کر خود انسانی وجود کے مرکزی مسئلے کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلمہ نظام اخلاق کو موجودہ حقائق کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی محسوس کرنے لگے۔ نتیجتاً جو موضوعات جدید فکشن میں رائج ہوئے وہ یہ ہیں۔

۱۔ جنگ اور فوجی زندگی کی عکاسی اور اس میں فرد کی طرف ارباب اقتدار کی بے اعتنائی۔

۲۔ نسلی تشخص کی تلاش اور سفید ایسٹیبلشمنٹ کے ساتھ نیگرو اور یہودی اقلیتوں کا تعلق

۳۔ شکست خوردہ ہیرو اپنے ماحول سے متصادم مگر اسے بدلنے سے معذور

۴۔ انسانی معاملات میں موقع اور لایعنیت کا کردار۔

۵۔ مالدار معاشرے میں نفسیاتی ہم آہنگی کا فقدان

۶۔ جنسی لذت اندوزی اور جنسی کج روی

۷۔ بیگانگی کا احساس (Sense of alienation)

۸۔ ہیرو یا اینٹی ہیرو (اینٹی ہیرو سے مراد ایسا ہیرو ہے جو ہیرو کی طرح کسی ناول یا افسانے یا ڈرامے کا مرکزی کردار تو ہے لیکن اس میں ہیرو کی غیر معمولی خوبیاں نہیں ہیں) کا اپنے حالات سے باغی ہونا اور بغاوت کا اپنے مقصد کے اعتبار سے بے سود ہونا۔

امریکہ کے جو ناول نگار اور ڈراما نگار وجودی مانے جاتے ہیں ان کے نام ان کی مشہور تصانیف کے ساتھ حسب ذیل ہیں۔

1- The Naked and The Dead

by Norman Mailer

2- Catch - 22

by Joseph Heller

3- Naked Lunch

by William Burroughs

4- On the Road

by Jack Kerouac

5- Invisible Man

by Ralph Ellison

6- Native Son

by Richard Wright

7- Go tell it on the Mountain

by James Baldwin

8- The Assistant

by Bernard Malamud

9- The Dangling Man

by Saul Bellow

10- The Professor of Easire

by Philip Roth

11- Giles Goat Boy

by John Barth

12- V

by Thomas Pynchan

13- The American Dream

by Edward Albee

14- The Cannibal

by John Hawkes

15- The Thin Red Line

by James Jones

قیام پاکستان کے بعد اردو کے نہایت ممتاز نقاد حسن عسکری کی بدولت اردو ادب میں وجودیت اور بعض وجودی مفکرین (سارتر اور کامیو) کا ذکر بہت رہا ہے۔ اردو میں سارتر اور کامیو کے بعض افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں' وجودیت اور ان وجودیوں پر کچھ مضامین بھی لکھے گئے شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ مغرب کی دوسری ادبی اور فکری تحریکات سے زیادہ وجودیت پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ اردو کے بعض شعرا کے ہاں وجودی خصوصیات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ خاص طور پر اقبال کو کھینچ تان کر وجودی شاعر ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وجودیت اردو کے تخلیقی ادب پر اثر انداز نہیں ہو سکی ہے۔ اردو کا کوئی ایک بھی شاعر یا ناول نگار یا افسانہ نگار وجودی فکر کا نمائندہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اردو میں وجودیت اور وجودی مفکرین کی تشریح و توضیح کے لیے کچھ مضامین ضرور لکھے جاتے رہے ہیں۔ جن سے تشریح و توضیح کا حق بھی ادا نہیں ہو سکا ہے۔ آج تک وجودی مفکرین کے نظریات اردو قارئین کے لیے عام فہم نہیں بن سکے ہیں جس حد تک وہ نظریات قابل فہم بن سکے ہیں اس حد تک بھی وہ قابل قبول نہیں بن سکے ہیں۔ شاید بن بھی نہیں سکتے۔ پاکستان کے مسلم معاشرے میں ان نظریات کا قابل قبول بننا کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔ اس راہ میں معاشرتی اور مذہبی دشواریاں حائل ہیں۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ ہمارے ہاں تنقید اور فلسفے سے تعلق رکھنے والوں نے عہد حاضر کے اس مقبول فلسفے سے دلچسپی کا اظہار ضرور کیا ہے۔ اس فلسفے سے غافل یا بے خبر رہ کر نہ تو عہد حاضر کی فلسفیانہ رفتار کو سمجھا جا سکتا ہے نہ معاصر انہ ادب کے بہت بڑے اور بہت سے اہم حصے کو۔

## ۳۔ مجوزہ کتابوں اور مقالوں کی فہرست

وجودیت اور وجودی مفکرین کو سمجھنے کے لیے اردو میں مندجہ ذیل تحریروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

۱۔ وجودیت از قاضی جاوید حسین مطبوعہ میری لائبریری لاہور

اس وقت تک اردو میں یہ واحد کتاب ہے جس میں وجودیت کے مرکزی مفکرین پر الگ الگ باب میں ان کے بنیادی نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس لحاظ سے اس کتاب کے ہر صفحے کا مطالعہ ضروری ہے۔

۲۔ تنقید اور تجزیہ از ڈاکٹر جمیل جالبی

اس کتاب کے تین مضامین (۱) سارتر ۔ ایک تعارف

(۲) سارتر' وجودیت اور ادب (۳) ژاں پال سارتر کا مطالعہ کریں۔

۳۔ فلسفہ جدید کے خدوخال: مرتبہ پروفیسر خواجہ غلام صادق اس کتاب میں

قاضی جاوید حسین کا مقالہ ''وجودی فلسفے کے منظر اور پس منظر'' کا مطالعہ کریں۔

۴۔ اردو ادب کی تحریکیں: ڈاکٹر انور سدید اس کتاب کا آٹھواں باب

''وجودیت کی تحریک'' پڑھیں

۵۔ اردو ادب کے مغربی دریچے: نظیر صدیقی

اس کتاب کا ایک مضمون ''کولن ولسن ۔۔۔ایک تعارف'' پڑھیں

۶۔ نئی تنقید : مرتبہ صدیق کلیم

اس کتاب کے تین مضامین کا مطالعہ ضروری ہے۔

۱۔ وجودیت اور انسان دوستی

۲۔ وجودیت اور سارتر

۳۔ اسطورہ سسی فس

## ۴۔ خودآزمائی

(وجودیت کا مطالعہ ان سوالات کی روشنی میں کریں)

۱۔ وجودیت بنیادی طور پر ایک فکری تحریک ہے یا ادبی تحریک؟

۲۔ وجودیت کے فلسفیانہ عقیدے اور اصول کیا ہیں؟

۳۔ وجودیت کائنات کے فلسفیانہ مطالعے پر زور دیتی ہے یا انسانی وجود اور انسانی تجربے کے مطالعے پر؟

۴۔ کیا وجودیت ھیگل کی عقلیت پرستی کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی؟

۵۔ وجودیت عقل کے مقابلے میں کس چیز پر زور دیتی ہے اور کیوں؟

۶۔ وجودیت کی کتنی قسمیں ہیں اور ان قسموں کے نمائندے کون فلسفی ہیں؟

۷۔ وجودیت کی کس قسم کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے اور اس کا خاص ترجمان کون ہے؟

۸۔ آزادی اور امید کا فلسفہ کہلانے کے باوجود وجودیت نے عہد حاضر کے ادب پر کس قسم کا اثر چھوڑا ہے؟

۹۔ کیا کولن ولسن کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ سارتر اور کامیو نے وجودیت کو جس بند گلی میں لا کر چھوڑ دیا تھا کولن ولسن اسے وہاں سے آگے لے گیا ہے؟

۱۰۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ اردو کے تنقیدی ادب میں وجودیت کا ذکر اور اس کے حوالے بہت ہیں لیکن اردو کے تخلیقی ادب پر اس کا اثر نظر نہیں آتا؟

# سرِ آغاز

ایم فل اردو پروگرام کا اجرا 1987ء میں ہوا اس زمانے میں' پروگرام کے چار و مطالعاتی رہنما ٹائپ کمپوزنگ میں اشاعت پذیر ہوئے۔ٹائپ کاری کی وجہ سے' یہ مطالعاتی رہنما اپنے مواد کی دل کشی اور جامعیت کے باوجود' اپنے مدہم اور مبہم انداز اشاعت کی بنا پر طلبہ اور عام قارئین کیلئے جاذب نظر نہ بن سکے' اب جبکہ شعبہ اپنے اکثر و بیشتر کورسوں پر نظر ثانی کا کام کر رہا ہے۔ایم فل کے مطالعاتی رہنما بھی نظر ثانی کے انہیں مراحل سے گزر کر نئے اور خوب صورت رنگ ڈھنگ سے جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ٹائپ کاری کی جگہ کمپیوٹر کمپوزنگ نے' مواد کی جامعیت کو جو رعنائی اور دل کشی عطا کی ہے' وہ یقیناً طلبہ کے لئے دل چسپی کا باعث ہوگی اور نئے ٹائیٹل کے ساتھ مواد کی پیش کش کا یہ انداز اہمیت اور افادیت کا حامل ہوگا۔

پیش نظر مطالعاتی رہنما میں جہاں ضرورت سمجھی گئی' وہاں ادبیات اردو میں تازہ علمی اور ادبی پیش رفت کے شمول اغماض نہیں برتا گیا۔ادب کے نئے رجحانات کی بھی نشاندہی کی گئی' تا کہ طلبہ کلاسیکی اور جدید طرز فکر کے ساتھ ساتھ جدید طرز احساس سے بھی آگاہ ہو سکیں۔اسی طرح اشاعت اول کے بعد' آسمان ادب پر طلوع ہونے والی نئی اور اہم کتابیں بھی مجوزہ کتب میں شامل کر دی گئیں۔آخر میں آپ سے استدعا ہے کہ مطالعاتی رہنما میں دیئے گئے رہنما اصولوں کی روشنی میں مجوزہ کتب کے مطالعے کو یقینی بنائیں اور جس قدر ممکن ہو' زیادہ سے زیادہ کتابوں سے استفادہ کریں۔

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی

صدر شعبہ اردو

مئی' 2004ء